بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پندرہ روزہ تعمیرِ حیات لکھنؤ

ISSN 2582-4619

جلد نمبر ۶۳ | ۲۵/دسمبر ۲۰۲۵ء مطابق ۵/رجب ۱۴۴۷ھ | شمارہ نمبر ۴

اس شمارے میں

آنکھوں تک آتے آتے پھر.....	جگر مرادآبادیؒ	۴
'یہ نکتہ میں نے سیکھا ابوالحسن سے'	محمد عمیر الصدیق ندوی	۵
تفسیر سورۂ فاتحہ	حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی	۷
دعوت میں تدریج کی اہمیت	عبدالرشید راجستھانی ندوی	۹
جہاد کے صحیح مفہوم کو سمجھنے کی ضرورت	حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ	۱۰
مولانا سید ابوظفر ندویؒ	شاہ اجمل فاروق ندوی	۱۲
ملتِ ابراہیمی قرآن کی روشنی میں	مولانا عبدالسبحان ناخدا ندوی	۱۴
بقائے امت کا راز	ڈاکٹر محمد وثیق ندوی	۱۵
اسلاموفوبیا-نفسیاتی دباؤ اور تہذیبی چیلنج	محمد ناصر ندوی پرتاپگڑھی	۱۶
اچھے اخلاق کے فوائد اور اثرات	محمد کلام الدین ندوی	۱۸
اللہ کی مدد کیوں نہیں اترتی؟	محمد سمعان خلیفہ ندوی	۲۰
اخوت کا بیاں ہوجا محبت کی زباں ہوجا	محمد ناظم اشرف ندوی	۲۲
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں، وہی طٰہٰ	محمد جاوید اختر ندوی	۲۴
تعارف وتبصرہ	محمد اصطفاء الحسن ندوی	۲۵
کتب خانۂ شبلی سے مکتبہ اسکوریال تک	سید حذیفہ علی ندوی	۲۷
اتحاد کی مشترک بنیادیں	محمد نفیس خان ندوی	۳۰
پیر ذوالفقار نقشبندی نہیں رہے	ادارہ	۳۲
سوال وجواب	مفتی محمد ظفر عالم ندوی	۳۳

سرپرست

حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی

(ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

مدیر مسئول

شمس الحق ندوی

نائب مدیر

محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی

معاون مدیر

محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی

محمد نفیس خان ندوی ❀ محمد جاوید اختر ندوی

مجلس مشاورت

مولانا عبدالعزیز بھٹکلی ندوی ❀ مولانا محمد خالد غازیپوری ندوی

قارئین محترم! تعمیرِ حیات کا سالانہ زرِ تعاون ذیل میں دیے گئے اکاؤنٹ میں جمع کرائیں!

TAMEER E HAYAT
A/c. No. 10863759868 (Current A/c.)
IFSC Code : SBIN0000125 – Swift Code : SBINNB157
State Bank of India, Main Branch, Lucknow

براہِ کرم رقم جمع ہوجانے کے بعد دفتر کے فون نمبر یا ای میل پر خریداری نمبر کے ساتھ اطلاع ضرور دیدیں۔

ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتہ

TAMEER–E–HAYAT
Tagre Marg, Badshah Bagh, Lucknow - 226007, Call : 9559844716
website : http://tameerehayat.com - email : tameer1963@gmail.com

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

سالانہ زرتعاون -/500	فی شمارہ -/25	ایشیائی، یورپی، افریقی وامریکی ممالک کے لئے۔ $100

ڈرافٹ منیجر تعمیر حیات کے نام سے بنائیں اور دفتر تعمیر حیات ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پتہ پر روانہ کریں۔ چیک سے بھیجی جانے والی رقم صرف All CBS Payable Multicity Cheques روانہ فرمائیں، بصورت دیگر =/30₹ جوڑ کر چیک دیں۔ براہ کرم اس کا خیال رکھیں۔

آپ کی خریداری نمبر کے نیچے اگر سرخ لکیر ہے تو سمجھیں کہ آپ کا زرتعاون ختم ہوچکا ہے، لہٰذا جلد ہی زرتعاون ارسال کریں۔ اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں، موبائل یا فون نمبر اور پتے کے ساتھ پن کوڈ بھی لکھیں۔ (منیجر تعمیر حیات)

پرنٹر پبلشر محمد طٰہٰ اطہر نے آزاد پرنٹنگ پریس، نظیر آباد، لکھنؤ سے طبع کراکے دفتر تعمیر حیات مجلس صحافت ونشریات ٹیگور مارگ، بادشاہ باغ لکھنؤ سے شائع کیا۔

شعر وادب

آنکھوں تک آتے آتے پھر دل میں جا ٹھہرنا

جگر مرادآبادیؒ

ہر دم دعائیں دینا ہر لحظہ آہیں بھرنا
ان کا بھی کام کرنا اپنا بھی کام کرنا

ہاں کس کو ہے میسر یہ کام کر گزرنا
اک بانکپن سے جینا، اک بانکپن سے مرنا

جو زیست کو نہ سمجھیں جو موت کو نہ جانیں
جینا انہیں کا جینا، مرنا انہیں کا مرنا

تیری عنایتوں سے مجھ کو بھی آ چلا ہے
تیری حمایتوں میں ہر ہر قدم گزرنا

ساحل کے لب سے پوچھو دریا کے دل سے پوچھو
اک موج تہ نشیں کا مدت کے بعد ابھرنا

اے شوق تیرے صدقے پہنچا دیا کہاں تک
اے عشق تیرے قرباں جینا ہے اب نہ مرنا

ہر ذرہ آہ جس کا لبریز تشنگی ہے
اس خاک کی بھی جانب اے ابرِ تر گزرنا

دریا کی زندگی پر صدقے ہزار جانیں
مجھ کو نہیں گوارا ساحل کی موت مرنا

رنگینیاں نہیں تو رعنائیاں بھی کیسی
شبنم سی نازنیں کو آتا نہیں سنورنا

اشکوں کو بھی یہ جرأت، اللہ ری تیری قدرت
آنکھوں تک آتے آتے پھر دل میں جا ٹھہرنا

اے جان ناز آ جا آنکھوں کی راہ دل میں
ان خشک ندیوں سے مشکل ہو کیا گزرنا

ہم بے خودان غم سے یہ راز کوئی سیکھے
جینا مگر نہ جینا، مرنا مگر نہ مرنا

کچھ آ چلی ہے آہٹ اس پائے ناز کی سی
تجھ پر خدا کی رحمت اے دل ذرا ٹھہرنا

خون جگر کا حاصل اک شعر تر کی صورت
اپنا ہی عکس جس میں، اپنا ہے رنگ بھرنا

اداریہ

'یہ نکتہ میں نے سیکھا ابوالحسن سے'

محمد عمیر الصدیق ندوی

ماہ وسال کی گردشوں کے تعلق سے عموماً کہا جاتا ہے کہ یہ گردشیں' رات دن کے الٹ پھیر کے عمل میں اس لیے مصروف رہتی ہیں کہ ان سے 'حساب' اور 'سنین' کا علم حاصل ہوتا رہے، اور اس علم کے ذریعہ یہ یقین بھی پختہ تر ہوتا ہے کہ کائنات کا یہ نظام اللہ تعالیٰ نے یوں ہی نہیں برپا کیا ہے، اسی لیے شاید انسان کی فطرت اور سرشت میں یہ عنصر ضروری طور پر شامل کر دیا گیا کہ دن ہوں، مہینے ہوں یا سال اور صدیاں ہوں' سب انسانی یادداشتوں پر محیط وشامل ہوتے جاتے ہیں۔

عام چلن یا زمانہ کا جبر ہے کہ یادوں کے نقوش۔ شمسی حساب کی روشنی کے زیادہ عادی ہو چکے ہیں۔ دسمبر کا مہینہ ہے۔ جہاں یہ زندگی کی منزل کا ایک پڑاؤ ہے' وہیں اس کے حوالہ سے یادوں کا ایک جہاں بھی آباد ہوتا نظر آتا ہے۔ خصوصاً اس مہینہ کی آخری تاریخ اس لیے بھی یادوں کی دنیا کی تاریخ کا حصہ بن جاتی ہے کہ اسی دن، اس عالم فانی نے آخری بار اس ہستی کو اپنے رفیقِ اعلی کے حضور حاضر ہوتے دیکھا' جس نے حیاتِ مستعار کے چھیاسی سال اسی دنیائے فانی میں اس طرح گذارے کہ اس کی ہر سانس گویا حیاتِ جاودانی کی نوید بنتی رہی۔ کیسی عجیب بات ہے کہ اسی دسمبر کی پانچ تاریخ، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی اس دنیا میں آمد کی یاد بنی، اور پھر اسی دسمبر کی آخری تاریخ ان کی حکایتِ ہستی کی انتہا کی خبر بن گئی۔

پچیس سال گزر گئے؛ لیکن حضرت مولاناؒ امت کی یادوں اور باتوں میں اپنی حیاتِ دنیوی ہی کی طرح زندہ ہیں۔ امت کے مسائل اور مصائب؛ بلکہ عالمِ انسانیت کی تمام آزمائشیں اس وقت بھی تھیں اور شیطانی وجود کی وجہ سے شر وفتنہ کا ایک سلسلہ بھی جاری ہے۔ آدم وشیطان کی یہ آویزش' قیامت تک کے لیے ہے۔ اس لیے ہر آن قیامتوں کا بپا ہونا' یوم حساب کی حقانیت کی دلیل ہے۔ اور دلیل اس بات کی بھی ہے کہ ہر قیامت کی ہولناکی سے آگاہ کرنے والے اور یومِ حساب سے خبردار کرنے والوں کا وجود انسانوں کے لیے ناگزیر ہے۔ یہ وجود ظاہری بھی ہوتا ہے اور معنوی بھی۔ آفتاب کے روپوش ہونے سے آفتابی اثرات زائل نہیں ہوتے۔ ماہتاب خود اس کی دلیل ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی شخصیت کے ہشت پہل ہونے کا اعتراف' عام ہے۔ مولانا کی حکمت وبصیرت اور دور اندیشی کی خوبیاں ان کی دوسری خوبیوں کی طرح زبانوں پر آجاتی ہیں؛ لیکن آج پچیس سال بعد انسانیت جس گردابِ بلا سے دوچار ہے' اس کی ہلاکتوں اور تباہیوں کا جو احساس حضرت مولانا کو تھا' اس پر خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ مولاناؒ نے پیامِ انسانیت کے ذریعہ انسانیت کے زوال کو زندگی کے سب سے بڑے عذاب سے تعبیر کیا۔ اس عذاب سے نجات دلانے والوں کے لیے مولانا نے جو فرمایا' اس کا نہایت غور طلب حصہ یہ ہے کہ انسان کے لیے، انسان کا حوصلہ بڑھانے کے لئے سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ

اس پر اعتماد کیا جائے۔ اس کو شک کی نگاہ سے نہ دیکھا جائے۔ اگر اس کو کسی چیز کی فکر ہے یا اس کے دل میں کوئی درد ہے تو اس درد کی قدر کی جائے، اور اس کے درد میں شریک ہونے کی کوشش کی جائے۔ اگر یہ احساس دنیا میں نہیں تو پھر یہ دنیا' ضمیر اور دل رکھنے والوں کی جگہ نہیں۔

پچیس سال بعد ملک اور دنیا کی ہر وہ جگہ جہاں انسانیت نے حیوانیت کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے' یہ پیغام پہنچنا چاہیے۔ پچیس سال پہلے جتنی اس پیغام کی اہمیت تھی' آج اس سے کہیں زیادہ اس کی اہمیت اور ضرورت ہے۔

انسانیت ہر دور اور ماحول میں اپنے معنوں سے آشنا اور اپنے بلند مقام سے اسی وقت سرفراز ہوئی ہے جب اس نے اپنے مخلصوں اور محسنوں کی امانت داری اور خیر خواہی پر اعتماد کیا، اور ان کی بے غرضی اور بے لوثی پر یقین کیا۔ دسمبر کی ہر آخری تاریخ ایسے ہی ایک مخلص، امین اور بے غرض و بے لوث کی صدائے درد کی بازگشت کو یاد کرنے کی علامت بن جاتی ہے۔ بے شمار رحمتوں کی بارش ہو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی پاک روح پر۔

☆☆☆

ہماری سوچ کا دائرہ

مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندویؒ

بات اگر اپنی ہو تو دل لگتا ہے، تو کیوں نہ آج اپنی ہی بات کی جائے؟ کیوں نہ اپنے حالات کا جائزہ لیا جائے؟ کیوں نہ اپنی کمزوریوں اور خامیوں کی نشاندہی کی جائے؟ مجلس اپنی ہے، غیر کا یہاں گذر نہیں، چھپانے کی یہاں کچھ ضرورت نہیں، بڑی طاقتوں، ان کے منصوبوں اور سازشوں اور ان کی اسلام دشمن پالیسیوں کے تذکرہ سے تو اخبارات ورسائل بھرے رہتے ہیں، ان مسائل کو گفتگو کا موضوع بنانے سے کیا حاصل جو حکومت اور ذمہ داران حکومت سے تعلق رکھتے ہیں اور ہم سوائے غصہ کے اور دل کی بھڑاس نکالنے کے اس سلسلہ میں کچھ نہیں کر سکتے، ہم کو اپنی فکر کرنی چاہیے، اپنا جائزہ لینا چاہیے اور پھر اس جائزہ کی روشنی میں تبدیلی لانے کی کوشش کرنی چاہیے، جو مسائل ہم حل کر سکتے ہیں پہلے ہم کو ان مسائل پر گفتگو کرنی چاہیے جس دائرہ میں رہ کر ہم کام کر سکتے ہیں اسی دائرہ میں رہ کر ہم کو کام کرنا چاہیے، اور اگر ہم اس طرح زندگی گذارنے میں کامیاب ہو گئے تو دشمن کے یہ سارے منصوبے، ان کی یہ پالیسیاں، ان کو حاصل یہ سارے وسائل، ذرائع ابلاغ پر ان کا یہ کنٹرول، یہ فوجی برتری ان کے کچھ کام نہ آئے گی، ماضی کے واقعات اس پر شاہد ہیں اور تاریخ کی کتابوں میں وہ سب محفوظ ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم جگہ جگہ ناکام ہیں اور ہمیں اپنی ناکامی کا احساس بھی ہے اور ناکامی کے اسباب کی تلاش بھی، ناکامی کی ایک بڑی وجہ اگر یہ قرار دی جائے کہ ہم ریت کے ذرات کی طرح بکھرے ہوئے اور خودرو پودوں کی طرح ادھر ادھر اُگے ہوئے ہیں تو شاید یہ غلط نہ ہوگا، ہمیں صرف اپنی ذات سے دلچسپی ہے، صرف اپنی عزت وشہرت اور دولت ومنصب کی فکر ہے، اپنی ذات کے خول سے جب ہم باہر نکلتے ہیں تو اولاد تک پہنچ کر ہمارے قدم رک جاتے ہیں، خیال اب صرف یہ رہتا ہے کہ ہماری اولاد پڑھ جائے، جلدی سے کام میں لگ جائے اور ایک خوش حال اور آرائش و آسائش سے بھرپور زندگی گذارنے کا اسے موقع مل جائے، اولاد سے اوپر اٹھتے ہیں تو اپنی تنظیم، اپنی پارٹی، اپنی سوسائٹی، اور اپنے ادارے میں محصور ہو کر ہر طرف سے اپنی آنکھیں موند لیتے ہیں، یہی ہماری سوچ کا دائرہ اور یہی ہماری فکر کا محور ہے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اسی ذہنیت اور اس طرز فکر کو قوموں کے لیے خطرناک ترین قرار دیتے ہیں، وہ فرماتے ہیں: ''اس ذہنیت نے قوموں کے چراغ گل کر دیے، جہاں یہ ذہنیت طاری ہوتی ہے وہاں کوئی سر پٹک کر رہ جائے اور کوئی بڑے سے بڑا مصلح اپنی پوری زندگی صرف کر دے کوئی اثر نہیں ہوتا، ساری خرابی کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا ذہن اجتماعی نہیں، ملی نہیں، بلکہ ذہن انفرادی اور شخصی ہے، ملت کے مسائل اور دین کے تقاضوں کا درد اگر آپ کے دل میں نہیں اور مل کر کام کرنے کا جذبہ نہیں اور ایک دوسرے کی رعایت کرنے کا مزاج نہیں تو پھر بہت بڑا خطرہ ہے، نہ کوئی انجمن کچھ کر سکتی ہے، نہ کوئی ادارہ، نہ اخبار کچھ کر سکتا ہے اور نہ کوئی رسالہ اور نہ کوئی تقریر کچھ کر سکتی ہے اور نہ کوئی وعظ''۔

☆☆☆

تعلیم القرآن

تفسیر سورۂ فاتحہ

حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء)

{اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ}
(اصل تعریف اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے)۔

یہاں ''حمد'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور اس پر الف لام بھی داخل ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ الف لام استغراق کے لیے ہے یعنی حمد کی تمام بنیادی شکلیں اصلاً اللہ ہی کے لیے ہیں، حمد کے معنی ہیں: تعریف کرنا، آدمی اپنے اختیار سے جو کمال حاصل کرتا ہے، اس پر کی جانے والی تعریف کو ''حمد'' کہتے ہیں، ظاہر ہے کہ اگر آدمی کوئی بھی کمال حاصل کرتا ہے تو اس کو اس میں تصرف کا حق حاصل نہیں ہوتا، بلکہ اللہ کے کرنے سے ہی ہوتا ہے، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کے جو کمالات وصفات ہیں' وہ سب خود اسی کے اختیار کیے ہوئے ہیں، اسی لیے بنیادی طور پر حمد کے لائق ذات صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کی ہے۔ حمد کے مقابلہ میں شکر کا لفظ عام ہے، شکر بندوں کے لیے بھی ہوتا ہے، قرآن مجید میں دوسری جگہوں پر اس کا تذکرہ ہے، لیکن حمد کا استعمال صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کے لیے ہوتا ہے، اس کے اندر شکر بھی ہے اور اس کی تعریف بھی۔

''رب'' اسے کہتے ہیں جو تمام ضروریات کا تکفل کرنے والا ہو، پروان چڑھانے والا ہو اور تمام ضروریات کو دیکھ کر ان کو پورا کرنے کے لیے اسباب ووسائل فراہم کرنے والا ہو۔ ''رب'' کا لفظ اگر تنہا استعمال ہو تو صرف اللہ کے لیے ہوگا، اگر اضافت کے ساتھ ہو تو یہ بات کہی جاتی ہے کہ اس کا استعمال دیگر لوگوں کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے مثلاً: ''رب البیت''، یعنی گھر کا مالک لیکن جب یہ لفظ تنہا استعمال ہو تو وہ صرف اللہ کے لیے ہی ہوتا ہے۔

''العالمین'' عالم کی جمع ہے جس کے معنی ''جہان'' کے ہیں، گویا مجموعہ مخلوق کو ''عالم'' کہتے ہیں، یہاں ''العالمین'' کے لفظ سے مراد یہ ہے کہ دنیا میں مخلوقات کی جتنی بھی قسمیں ممکن ہیں' وہ سب اس میں شامل ہیں، چاہے وہ عالم انس ہو یا جن، عالم حیوانات ہو یا نباتات وجمادات، حقیقت میں تمام عالم اللہ تبارک وتعالیٰ کے پیدا کیے ہوئے ہیں اور وہی ان کا رب ہے۔

اس آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ کو ''رب العالمین'' کہا گیا کہ وہ خالق بھی ہے اور تمام جہانوں کا پروردگار بھی، پروردگار اسے کہتے ہیں جو پرورش وپرداخت کرنے والا ہو اور ضروریات کا پورا کرنے والا ہو۔ آیت میں ''العالمین'' کے ساتھ ''رب'' کا لفظ آیا ہے، ظاہر ہے کہ اللہ کے علاوہ تمام جہانوں کا کوئی رب ہو ہی نہیں سکتا، تمام جہانوں کا پیدا کرنے والا اور تمام جہانوں کی ضرورتیں پوری کرنے والا صرف اور صرف وہی اللہ ہے۔

{اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ} (بہت مہربان نہایت رحم والا ہے۔)

''رحمن'' و ''رحیم'' یہ دونوں لفظ ر-ح-م' کے مادہ سے مشتق ہیں، اس کے معنی رحمت کے ہیں اور یہ دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں یعنی وہ ذات جو انتہائی رحمت والی ہو۔ ان میں بھی ''رحمن'' کے اندر ''رحیم'' کے مقابلہ میں مبالغہ زیادہ ہے، بعض نے یہ بات کہی کہ ان دونوں میں لطیف فرق بھی ہے اور وہ یہ کہ رحمن سے وسعت مراد ہے اور رحیم سے کیفیت یعنی گہرائی مراد ہے، اسی لیے مفسرین یہ بات بھی کہتے ہیں کہ رحمن کا تعلق اصلاً دنیا سے ہے اور رحیم کا اصل تعلق آخرت سے، اس طور پر کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمت دنیا میں بہت وسیع ہے، ہر بندہ کے ساتھ اللہ کی رحمت شامل ہے، دنیا میں حضرت آدم سے لے کر قیامت تک جو بھی لوگ پیدا ہوں گے، اللہ تعالیٰ نے کسی کو محروم نہیں کیا، وہ ہر ایک کو غذا دیتا ہے، ہر ایک کے لیے پانی' ہوا اور ضرورت کی ساری چیزیں فراہم کرتا ہے، اس لیے اگر دیکھا جائے تو دنیا میں اللہ کی رحمت ہر ایک کے لیے ہے، اس دنیا میں اللہ نے اپنے دشمنوں کو بھی اپنی رحمت سے محروم نہیں کیا، لیکن آخرت میں اس کی رحمت اس کے خاص ایمان والے بندوں اور اس کو ماننے والوں کے لیے ہے۔

آخرت میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی جو رحمت ہے' اس کے اندر بڑی گہرائی ہے، وہاں اللہ کی جو نعمتیں حاصل ہوں گی اور جو رحمتیں ملیں گی' وہ اتنی زیادہ ہیں اور ان کے اندر اتنا مزہ ہے کہ دنیا میں اس کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا، حدیث میں آتا ہے کہ:

''مَا لاَ عَیْنٌ رَأَتْ وَلاَ أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلاَ خَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ۔'' (البخاری: ۳۲۴۴)

(جنت کی نعمتیں ایسی ہوں گی کہ) نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا اور نہ ہی کسی انسان کے دل میں کبھی ان کا خیال آیا۔)

یعنی جنت میں اللہ کی ایسی نعمتیں حاصل ہوں گی کہ جن کا خیال اس دنیا میں تصور سے باہر ہے، اس لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی آخرت کی رحمت بڑی عمیق اور بہت زیادہ ہوگی۔ حاصل یہ کہ دنیا میں

اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمت اس کے سب بندوں کو شامل ہے، تاہم آخرت میں اس کی رحمت صرف اس کے ایمان والے بندوں کے لیے ہے مگر بہت زیادہ ہے اور آخری حد تک ہے۔

رحمن ورحیم کی صفات کا ''حمد'' کے لفظ سے بڑا تعلق ہے یعنی تعریف ہے اس اللہ کے لیے، شکر ہے اس اللہ کے لیے جو جہانوں کا پروردگار ہے اور بہت مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔ ''بہت مہربان'' کا مطلب یہی ہے کہ اس کی رحمت بہت وسیع ہے، سب کو حاصل ہے اور ''نہایت رحم والا ہے'' یعنی اس کی رحمت تصور سے ماورا ہے، جب وہ دینے پر آتا ہے تو ایسا دیتا ہے کہ آدمی سوچ نہیں سکتا، کبھی دنیا میں بھی اللہ کی رحمت تصور سے زیادہ ہوتی ہے، لیکن آخرت کی رحمتیں تو ایسی ہیں کہ انہیں ذہن ودماغ میں لانا بھی ممکن نہیں۔

{مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ}

(بدلہ کے دن کا مالک ہے)۔

یہ بھی اللہ کی ایک صفت ہے، ''دین'' کہتے ہیں بدلہ یعنی حساب کو، حدیثوں میں اس کا ذکر ہے کہ:

''اَلْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ وَالْعَاجِزُ مَنْ أَتْبَعَ نَفْسَهُ هَوَاهَا وَتَمَنَّى عَلَى اللهِ'' (سنن الترمذی: ۲۶۴۷) (عقل مند شخص وہ ہے جو اپنے نفس کا حساب لے اور موت کے بعد کے لیے عمل کرے اور کم عقل وہ ہے جو اپنے نفس کی پیروی کرے اور اللہ سے امیدیں لگائیں)۔

''دَانَ - يَدِيْنُ - دَيْناً'' کے معنی حساب کرنے کے ہیں اور ''یوم الدین'' کا مطلب ہے ''حساب کا دن''۔ اس جگہ یوم الدین سے مراد روز قیامت ہے جو اصل حساب کا دن ہوگا، اس دنیا میں تو آدمی سب کچھ حساب کرتا ہے، اپنی دوکان کا حساب، دنوں کا حساب، مہینوں کا حساب، لیکن آخرت میں اللہ کی طرف سے جو حساب لیا جائے گا وہ پوری زندگی کا حساب ہوگا، آدمی نے جو کچھ کیا ہوگا وہ سب کچا چٹھا سامنے آجائے گا اور وہاں اللہ تبارک وتعالیٰ اس سے حساب لے گا کہ اس نے جو کیا ہے وہ اچھا کیا ہے یا برا؟ وہ سب وہاں بالکل عیاں ہوجائے گا، قرآن میں ہے:

{مَا يَلْفِظُ مِن قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ} (ق: ۱۸) (جو بات بھی اس کے منہ سے نکلتی ہے تو اس کے پاس ہی ایک مستعد نگراں موجود رہتا ہے)

اللہ تبارک وتعالیٰ نے دنیا میں کراماً کاتبین متعین کردیئے ہیں، انسان جو کچھ بھی کرتا یا کہتا ہے وہ سب نوٹ کرتے رہتے ہیں اور اس طرح کرتے ہیں کہ کل قیامت میں وہ سب چیزیں اس طرح سامنے آجائیں گی جیسے انہیں وہ دیکھ رہا ہو، ارشاد ہے: {وَكُلَّ إِنسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَاباً يَلْقَاهُ مَنشُوراً} (الإسراء: ۱۳) (اور ہر انسان کے اعمال کو ہم نے اس کی گردن میں لگادیا ہے اور قیامت کے دن ہم اس کو ایک کھلی کتاب کی طرح نکال کر اس کے سامنے کردیں گے)۔

آج کل یہ سمجھنا بڑا آسان ہے، آدمی کسی منظر کی موبائل میں ویڈیو بنالیتا ہے اور وہ محفوظ ہوجاتی ہے، جب وہ دیکھنا چاہے تو دیکھ سکتا ہے اور کسی کو دکھا بھی سکتا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے کراماً کاتبین کو ایسی صلاحیت دی ہے کہ وہ گویا پوری تصویر محفوظ کرلیتے ہیں، انسان جو کچھ کر رہا ہے، جو کہہ رہا ہے اور جن چیزوں سے گذر رہا ہے، وہ سب محفوظ کرلیتے ہیں اور کل قیامت میں وہ ساری تصویر سامنے آجائے گی، گویا Reel چلا دی جائے گی، وہاں تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت ایسی ہوگی کہ وہاں کسی اسکرین کی بھی ضرورت نہیں ہوگی، اللہ ایسے ہی دکھادے گا کہ تم دنیا میں کیا کرتے تھے؟

سورۂ فاتحہ میں قیامت کے روز کو ''بدلہ کا دن'' کہا گیا، اس لیے کہ اللہ کی طرف سے بدلہ دیا جائے گا، انصاف کے ترازو نصب کیے جائیں گے، اچھے اور برے اعمال تولے جائیں گے، پھر اس کے بعد پورے انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت کے دن کا مالک بھی ہے اور ملک بھی، اسی لیے اس آیت کو {مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ} اور بعض قرأتوں میں {مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ} بھی پڑھا گیا ہے، ''مالک'' اور ''مَلِک'' میں معمولی فرق ہے، مالک وہ ہے جو پوری طرح کسی چیز کی ملکیت رکھتا ہو اور ملک وہ ہے جو پوری قدرت وبادشاہت رکھتا ہو، کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی مالک تو ہوتا ہے لیکن جس درجہ کی قدرت ہونی چاہیے وہ نہیں ہوتی اور کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی بادشاہ ہوتا ہے لیکن پوری ملکیت نہیں رکھتا، یہاں پر ''مالک'' اور ''مَلِک'' دونوں مفہوم شامل ہیں کہ وہ بادشاہ بھی ہے اور اس کے ساتھ تصرف کامل بھی رکھتا ہے، قیامت کے روز یہ دونوں چیزیں پوری طرح سے اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کو حاصل ہوں گی اور وہ روز جزا کا مالک ہوگا، قرآن میں آتا ہے:

{لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ} (غافر: ۱۶) (آج کس کی بادشاہت ہے صرف اللہ ہی کی جو یکتا ہے زبردست ہے۔)

اس آیت شریفہ میں ملک کا لفظ استعمال ہوا ہے اور بعض آیتوں میں اس کے مالک ہونے کی طرف بھی اشارہ ہے۔

(باقی صفحہ نمبر ۱۱ر پر)

تعلیم الحدیث

دعوت میں تدریج کی اہمیت

عبدالرشید راجستھانی ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

عن ابن عَبَّاسٍ رضي الله عنهما يقُولُ: لَمَّا بَعَثَ النَّبِيُّ ﷺ مُعَاذَ بْنَ جَبَلٍ إِلَى نَحْوِ أَهْلِ الْيَمَنِ، قَالَ لَهُ: "إِنَّكَ تَقْدَمُ عَلَى قَوْمٍ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ، فَلْيَكُنْ أَوَّلَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَى أَنْ يُوَحِّدُوا اللَّهَ تَعَالَى، فَإِذَا عَرَفُوا ذَلِكَ، فَأَخْبِرْهُمْ أَنَّ اللَّهَ فَرَضَ عَلَيْهِمْ خَمْسَ صَلَوَاتٍ فِي يَوْمِهِمْ وَلَيْلَتِهِمْ، فَإِذَا صَلَّوْا، فَأَخْبِرْهُمْ أَنَّ اللَّهَ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ زَكَاةً فِي أَمْوَالِهِمْ، تُؤْخَذُ مِنْ غَنِيِّهِمْ فَتُرَدُّ عَلَى فَقِيرِهِمْ، فَإِذَا أَقَرُّوا بِذَلِكَ فَخُذْ مِنْهُمْ، وَتَوَقَّ كَرَائِمَ أَمْوَالِ النَّاسِ." (متفق عليه)

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو اہلِ یمن کی طرف بھیجا تو ان سے فرمایا: تم ایسے لوگوں کے پاس جا رہے ہو جو اہلِ کتاب میں سے ہیں، لہٰذا سب سے پہلی چیز جس کی طرف تم انہیں دعوت دو وہ یہ ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کو ایک مانیں۔ جب وہ اس بات کو پہچان لیں، تو انہیں بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر دن اور رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ پھر جب وہ نماز قائم کرنے لگیں، تو انہیں بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مالوں میں زکوٰۃ فرض کی ہے، جو ان کے مالداروں سے لی جائے گی اور ان کے محتاجوں کو دی جائے گی۔ پھر جب وہ اس کا اقرار کر لیں تو ان سے زکوٰۃ وصول کرنا، اور لوگوں کے بہترین اور قیمتی مال لینے سے بچنا۔

تشریح: حضرت رسول اللہ ﷺ نے جب معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف روانہ فرمایا تو انہیں چند جامع وصیتیں ارشاد فرمائیں، جو دعوت، تربیت، قیادت اور عدلِ اجتماعی کا ہمہ گیر دستور ہیں۔ یہ حدیث محض ایک تاریخی واقعہ نہیں بلکہ فرد اور معاشرے کی تعمیر کا متوازن نبوی منہج پیش کرتی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے سب سے پہلے توحید اور رسالت کی شہادت کی دعوت دینے کا حکم دیا، کیونکہ عقیدہ ہی دین کی بنیاد ہے۔ جب ایمان درست ہو جاتا ہے تو اعمال خود بخود سنورنے لگتے ہیں، اور اگر بنیاد کمزور ہو تو اعمال کی کثرت بھی فائدہ نہیں دیتی۔ اسی حکمت کے تحت آپ ﷺ نے نماز کا ذکر توحید کے بعد اور زکوٰۃ کا ذکر نماز کے بعد فرمایا، تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ دین میں ترتیب اور ترجیح کی بڑی اہمیت ہے۔

اس حدیث میں دعوت کا ایک عظیم اصول تدریج بھی سکھایا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے معاذ رضی اللہ عنہ کو یہ ہدایت نہیں دی کہ وہ لوگوں پر تمام احکام ایک ساتھ نافذ کریں، بلکہ آہستہ آہستہ انہیں دین کی طرف لائیں۔ یہ طریقہ انسانی فطرت کے عین مطابق ہے اور یہی حکمت، نرمی اور صبر دعوت کی کامیابی کی ضمانت بنتے ہیں۔

نماز اور زکوٰۃ کو ساتھ بیان کر کے یہ حقیقت واضح کی گئی کہ اسلام فرد اور معاشرے دونوں کی اصلاح چاہتا ہے۔ نماز بندے کے دل کو اللہ سے جوڑتی ہے اور زکوٰۃ بندے کو بندوں سے۔

زکوٰۃ کا نظام اس اصول پر قائم ہے کہ دولت چند ہاتھوں میں جمع نہ ہو بلکہ مالداروں سے لے کر ضرورت مندوں تک پہنچے، تاکہ معاشرے میں عدل اور توازن قائم رہے۔

نبی ﷺ نے زکوٰۃ وصول کرتے وقت لوگوں کے بہترین اور محبوب مال لینے سے منع فرمایا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت میں حقوق کے نفاذ کے ساتھ حسنِ سلوک اور انصاف بھی لازم ہے۔

دین کی تعلیمات دلوں پر بوجھ بننے کے لیے نہیں بلکہ انہیں مطمئن اور قریب کرنے کے لیے ہیں۔

آخر میں مظلوم کی بددعا سے ڈرا کر یہ واضح کر دیا گیا کہ ظلم کسی بھی صورت میں ناقابلِ قبول ہے۔ جسے اختیار دیا جائے، اس پر عدل فرض ہے، کیونکہ مظلوم کی آہ اللہ تک بلا روک ٹوک پہنچتی ہے۔ اس لیے ہر ذمہ دار شخص کو چاہیے کہ وہ اللہ سے ڈرتے ہوئے انصاف کو اپنا شعار بنائے۔

فائدہ: اس واقعہ میں یہ پیغام بھی پوشیدہ ہے کہ اسلام میں قیادت عمر یا منصب کی بنیاد پر نہیں بلکہ علم، تقویٰ اور صلاحیت کی بنیاد پر دی جاتی ہے۔ سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ جوان تھے مگر اہلیت میں نمایاں تھے، اسی لیے نبی ﷺ نے انہیں بڑی ذمہ داری سونپی۔

یہ چند نبوی ہدایات اپنے اندر دعوت کا منہج، تربیت کا اسلوب، معیشت کا اصول اور عدل کا معیار سموئے ہوئے ہیں۔ اگر امت انہیں اپنی عملی زندگی میں زندہ کر لے تو بہت سے فکری، اخلاقی اور سماجی مسائل خود بخود حل ہو سکتے ہیں۔

☆☆☆

چراغِ راہ

جہاد کے صحیح مفہوم کو سمجھنے کی ضرورت

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

اس وقت دنیا میں خود غرضی، نفع اندوزی، ظلم و زیادتی کا عام چلن ہو گیا ہے، اچھے اچھے امن پسند اور انسانیت دوست عنوانات سے حق تلفی، دھاندلی، انسان کشی اور بربریت کی حرکتوں کو چھپایا جاتا ہے اور من مانی کی جاتی ہے، یہ طریقہ ناانصافی اور ظلم کا اور اپنے مالک وخالق کی نافرمانی کا طریقہ ہے۔ ضرورت ہے ایسے حالات کو بدلنے کی اور انسانیت کو صحیح اور خیر پسندی کی راہ پر لانے کی۔

اسلام میں اس کی تعلیم دی گئی ہے، بلکہ اسلام کا اہم ترین مقصد ساری انسانیت کو اس راستہ پر لانا ہے اور اس پر چلانا ہے جو انسانیت کا صلاح و فلاح کا راستہ ہے۔

انسانیت کی اصل صلاح وفلاح کا تعلق آخرت کی زندگی سے ہے جس کے لیے تمہید وذریعہ دنیا کی یہی زندگی بنتی ہے، اس صلاح وفلاح کو جاننے اور سمجھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے دو ذریعے بنائے ہیں، ایک ذریعہ انسان کی عقل وفہم ہے کہ جو اپنی فطری حالت میں ہونے کی صورت میں زندگی کے اچھے برے کو سمجھ سکتی ہے، اور دوسرا ذریعہ وحی الٰہی ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتہ کے ذریعہ منتخب انسانوں کو انسانی زندگی کی ان اچھی اور بری باتوں سے باخبر رکھا جن کو انسان کی عام عقل وفہم پوری طرح متعین نہیں کرسکتی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ وحی فرشتوں کے ذریعہ اور بغیر فرشتوں کے بھی اپنے جن منتخب بندوں کی طرف بھیجی، وہ نبی کہلائے، ان میں آخری نبی حضرت محمد مصطفی (ﷺ) ہوئے، جنہوں نے دین کی باتوں کو جن سے انسانی زندگی کی اچھی اور بری باتیں متعین ہوتی ہیں اللہ کے حکم سے اور اس کی بھیجی ہوئی ہدایات کے لحاظ سے جامع اور وسیع شکل میں بتایا اور محفوظ کردیا اور یہ بتایا کہ دین صرف عبادات کا نام نہیں، بلکہ وہ تمام طور وطریق پر حاوی ہے جو انسان کو اس کی زندگی کی خیر وصلاح وفلاح کی راہوں پر چلنا بتاتا ہے، اسی جامع وکامل ہدایات کا نام اسلام ہے۔

لفظ اسلام کے معنی ہیں اپنے کو سپرد کردینا، جس کا مطلب ہے کہ انسان اپنی زندگی کے اطوار واخلاق کو اپنے خالق ومالک اللہ رب العزت کی مرضی کے سپرد کردیتا ہے، اللہ رب العزت جو انسانوں کا خالق ہے وہ انسانوں کے مزاج کو اور ضرورتوں کو اور صلاحیتوں کو جانتا ہے، اس لیے اس نے جو طور وطریق انسانوں کے لیے پسند فرمائے ہیں، وہ انسانوں کی ضرورت اور طاقت اور صلاحیت کے مطابق ہیں اور وہ انسان کے لیے صلاح و فلاح کی ضمانت بھی دیتے ہیں، اسلام میں انہیں ہدایات کو 'دین' کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے اسی دین کے ماننے والوں پر یہ ذمہ داری بھی رکھی ہے کہ وہ اپنے کو صلاح و فلاح کے مطابق بنانے کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی اس کے مطابق بنانے کی فکر کریں، اس کے لیے جو مناسب اور موزوں تدابیر ہیں وہ اختیار کریں، ان تدابیر کی ایک ترتیب رکھی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ جو لوگ ناواقف ہیں ان کو شفقت ومحبت کے ساتھ واقف کرایا جائے، اسی کا نام 'دعوت' ہے۔

اسی طریقہ سے ہر مسلمان کی حیثیت داعی کی بھی ہوجاتی ہے اور کم سے کم مسلمانوں کی ایک وقیع تعداد اس کام پر معمور رکھی گئی ہے، اور اس ذمہ داری کی انجام دہی اللہ تعالیٰ کو بہت مطلوب ہے، کیونکہ وہ انسانوں کو بھلا دیکھنا چاہتا ہے، لیکن جبر وتشدد سے نہیں، بلکہ افہام وتفہیم سے، یہ کام اللہ تعالیٰ کی نظر میں نہ صرف یہ کہ ضروری ہے بلکہ اس کی رحمت کو کھینچنے والا اور لانے والا ہے، اور یہ کام اگر کوئی بھی نہ کرے تو یہ کوتاہی انسانوں پر اللہ کے عتاب کے نازل ہونے کا سبب بن سکتی ہے۔ ہمیں تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں جہاں اس کام سے بالکل پہلوتہی کی گئی وہاں وہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ناراضی کے اثرات پڑے جو مصائب کی شکل میں اور تباہی کی شکل میں ظاہر ہوئے۔

دعوت کا کام افہام وتفہیم اور حکمت وموعظت کے ساتھ کرنے کے راستہ میں رکاوٹیں پیدا کی جائیں تو اللہ نے ان رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے مسلمانوں کو جو بھی معقول طریقے ہیں ان کو اختیار کرنے کی اجازت دی ہے، لیکن ان ذرائع کے ساتھ جو مسلمانوں کے لیے انسانی طور پر قابل عمل ہوں اور اسی نقطہ سے وہ مرحلہ شروع ہوتا ہے جس میں مجبور ہوکر بعض مرتبہ کوشش کرنے والوں کو سختی کا رویہ اختیار کرنے کی نوبت آجاتی ہے، لیکن یہ سختی ظلم کو روکنے اور صحیح راستہ میں رکاوٹ پیدا کرنے کا مقابلہ کرنے کے لیے ہوتی ہے تاکہ انسانوں کو صلاح وفلاح کا راستہ بتانے کا کام انجام پاسکے، یہ بات جب طاقت کے اعلیٰ وسائل ہوں تو ان کے ذریعہ بھی عمل میں آتی ہے، کسی کو اس کے اختیار کردہ طریقہ زندگی کو زبردستی بدلنے پر مجبور کرنے کی اجازت نہیں، قرآن مجید میں آتا ہے ”لا إكراه في الدين“ کہ دین کے معاملہ میں مجبور کرنا نہیں ہے، البتہ نصیحت وموعظت اور

ابلاغ حق کو روکنے میں سختی اختیار کرے تو اس کے مقابلہ میں سختی کرنے کی اجازت ہے۔

اس طرح اس ضرورت کو بتایا گیا ہے کہ حق کی باتوں کو اور انسانوں کے صلاح وفلاح کے طریقوں کو لوگوں کو بتایا جائے اور ان کی زندگیوں کو راہ راست پر لایا جائے تاکہ وہ اپنے خالق ومالک کی مرضی کے مطابق ہو سکیں اور اس کام کو روکنے نہ دیا جائے، خالق ومالک کی عبادت کے سلسلہ کو بند نہ ہونے دیا جائے، یہ کام امن وآشتی کے ساتھ کیا جائے، لیکن اگر اس میں رکاوٹ ڈالی جائے تو اس رکاوٹ کو دور کیا جائے اور اگر منظم رکاوٹ ڈالی جائے تو منظم طریقہ سے روکا جائے اور روکنے کی ضرورت بتائی گئی ہے، لہٰذا اللہ کے بندے اس راہ میں کوشش اور محنت کرتے ہیں کہ خود ہی اپنے طور طریق کو درست رکھنے کی فکر کرتے ہیں اور پھر دوسروں کے طور وطریق کو بھی درست کرنے کے لیے حکمت ومحبت کے ساتھ کوشش کرتے ہیں، اور جب سختی کا ان کو مقابلہ پڑتا ہے تو وہاں ان کو سختی کا جواب دینا پڑتا ہے۔ اس پورے عمل کو اللہ تعالیٰ نے ''جہاد'' کے لفظ سے بھی یاد کیا ہے اور جہاد کے معنی اصلاً سعیٔ بلیغ کرنے کے یعنی ہمت اور عزم کے ساتھ پوری کوشش کرنے کے ہیں، اور یہ اللہ کو بہت محبوب ہے، لیکن افسوس کی بات ہے کہ اس لفظ کے صحیح مفہوم اور معنی کو اس کے صرف ایک رخ کے ساتھ مخصوص سمجھا جانے لگا اور اس کا مطلب اسلام کے مخالفین محض لڑائی اور جھگڑے کے لینے لگے ہیں، حالانکہ اس سے جو عمل مقصود ہے وہ انسانوں کے ساتھ خیر خواہی اور ان کی خیر طلبی کا ہے، اس میں مقابلہ اور ٹکراؤ عموماً جواباً ہے اور مجبوری کا ہوتا ہے اور وہ اس کا صرف ایک رخ ہے، اور اس میں بھی یہ شرط ہوتی ہے کہ اس میں اصلاً اپنی ذاتی اور مادی اور دنیاوی منفعت پیش نظر نہ ہو، اس میں خیر طلبی مقصود ہو، اور اچھے مقصد کے لیے اپنے جان و مال کی قربانی کے جذبہ سے ہو۔

☆☆☆

بقیہ: تفسیر سورۂ فاتحہ

جیسے سورۂ فاتحہ میں {مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ} کہا گیا، ہم نمازوں میں بھی اسے پڑھتے ہیں اور یہ ایک متواتر قرأت ہے، لیکن اس کے ساتھ {مَلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ} بھی پڑھا گیا اور یہ بھی متواتر قرأت ہے، معلوم یہ ہوا کہ یہاں دونوں مفہوم شامل ہیں، وہاں اللہ کی پوری قدرت بھی ہے اور وہ وہاں کا مالک وبادشاہ بھی ہے، ظاہر ہے فیصلے اس کے ہاتھ میں ہیں اور وہاں کوئی کچھ نہیں بول سکتا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شفاعت کا جو حق حاصل ہوگا وہ بھی اللہ کی اجازت ہی سے ہوگا، وہاں کوئی چوں چرا نہیں کر سکتا، جب تک کہ اللہ کا فیصلہ نہ ہو اور اس کی اجازت نہ ہو۔

قیامت کے دن کی بہت سی تفصیلات قرآن مجید کی مختلف آیتوں اور حدیثوں میں بیان کی گئی ہیں لیکن سورۂ فاتحہ میں {مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ} کی یہ آیت ایسی ہے جو ان تمام تفصیلات کو سمیٹ لیتی ہے، یعنی وہ اس دن کا بادشاہ بھی ہے اور اس دن کا مالک بھی جو انصاف، فیصلوں اور آخرت کا دن ہے، اس کے بارے میں بھی قرآن مجید میں بہت سے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، کہیں ''یوم التغابن'' کہا گیا، کہیں ''یوم التناد'' کہا گیا، کہیں ''یوم الفصل'' کہا گیا، لیکن وہ بنیادی طور پر فیصلے کا دن ہے، انسان نے جو کچھ بھی یہاں دنیا میں کیا ہے اللہ تبارک وتعالیٰ اس کا فیصلہ وہاں فرمادیں گے اور لوگوں کے سامنے ساری چیزیں آجائیں گی، وہ ہار جیت کا دن ہے، پیشی کا دن ہے، فیصلہ کا دن ہے، بدلہ کا دن ہے۔

☆☆☆

غیر معمولی ایمان کی ضرورت

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

''ہم کھل کر کہتے ہیں کہ ہم اس کے محتاج ہیں کہ ہمارا ایمان تازہ ہو اور وہی ایمان پیدا ہو جو ہمارے اسلاف کا تھا۔ اس ہندوستان میں جو بزرگ اپنے اپنے وقت میں ایمان کے داعی اور مجدد گذرے ہیں انھوں نے بھی اُس وقت باوجود یہ کہ دین اور ایمان موجود تھا اور علمائے دین موجود تھے، ایمان کی تجدید کی دعوت دی، اور امت کے اندر ایک نئی ایمانی زندگی پیدا کردی۔ پھر ان قدیم الاسلام نو مسلموں سے وہ باتیں ظہور میں آئیں جنھوں نے قرن اول کی یاد تازہ کردی اور ثابت کردیا کہ ایمان میں بہت طاقت ہے اور اس طاقت کو ہر زمانہ میں زندہ کیا جا سکتا ہے۔ آج بھی اسی طاقت کی دنیا میں مثالیں ملتی ہیں جن سے اسلاف کی روایات تازہ ہو جاتی ہے۔

ہمارا افسردہ اور بوسیدہ ایمان مشکلات کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتا، معمولی حالات کا مقابلہ معمولی اور کمزور ایمان کر سکتا ہے، لیکن غیر معمولی حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے غیر معمولی طاقت کا ایمان درکار ہے۔ آج دنیا میں مسلمانوں کو غیر معمولی حالات کا سامنا ہے، اس لیے ہمیں اپنے ایمان میں غیر معمولی تازگی اور اپنی زندگی میں غیر معمولی تغیر پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔''

☆☆☆

فرزندِ ندوہ

ایک عظیم مؤرخ

مولانا سید ابوظفر ندویؒ

شاہ اجمل فاروق ندوی (دہلی)

تحریک ندوۃ العلماء سے ابتدا ہی سے ایسی شخصیات وابستہ رہیں، جن کا علم تاریخ سے خصوصی تعلق تھا۔ علامہ شبلی نعمانی، علامہ سید عبدالحی حسنی اور علامہ حبیب الرحمن خان شروانی کو اس ضمن میں سب سے امتیازی مقام حاصل ہے۔ اسی کا اثر تھا کہ ابتدا ہی سے دارالعلوم ندوۃ العلماء سے تعلیم حاصل کرنے والے علماء کو بھی فنِ تاریخ سے خصوصی مناسبت رہی۔ تاریخ کا ذوق رکھنے والے ایسے فرزندانِ ندوہ کی فہرست تیار کی جائے تو اس کے سرفہرست تین چار لوگوں میں مولانا سید ابوظفر ندوی کا اسم گرامی بھی شامل ہوگا۔ عجیب بات ہے کہ اس عظیم اسلامی مؤرخ کا حقیقی تعارف نہ اس کی زندگی میں ہوسکا اور نہ زندگی کے بعد۔ اسی لیے سید صباح الدین عبدالرحمن نے ان کی رحلت پر لکھے گئے اپنے نثری نوحہ میں کہا تھا:

''ان کی وفات کے بعد ملک میں ان کا ماتم اس طرح نہیں ہوا، جس طرح ہونا چاہیے، لیکن اہلِ نظر کی آنکھیں اس خیال سے ضرور اشک بار ہوئیں کہ ہندستان اور خصوصاً گجرات کی تاریخ پر ان کی ایسی دیدہ وری اور بصیرت رکھنے والا اہل قلم اب ملک میں کوئی نہیں رہا۔''

مولانا سید ابوظفر ندوی ۱۳۰۷ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد گرامی حضرت سید ابوحبیب دسنوی ایک صاحبِ نسبت بزرگ تھے۔ بھوپال کی عظیم روحانی ہستی حضرت شاہ ابواحمد مجددی سے بیعت اور ان کے صاحب زادے حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی کے خلیفہ تھے۔ وہ علومِ اسلامی کی نیرِ تاباں علامہ سید سلیمان ندوی کے برادرِ بزرگ بھی تھے۔ اس طرح مولانا سید ابوظفر ندوی سید صاحب کے سگے بھتیجے ہوتے تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ بارہ سال کی عمر میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل کیے گئے۔ وہیں سے تعلیم مکمل کی۔

مولانا سید ابوظفر ندوی کے مزاج میں تاریخ کا ذوق رچا بسا ہوا تھا۔ یہ ذوق علمی کاموں کے لیے جتنی یک سوئی اور استقلال کا طالب تھا، اتنی ہی ان کے مزاج وطبیعت میں غیر مستقل مزاجی کی آمیزش تھی۔ اسی لیے ندوہ سے فراغت کے بعد انھوں نے اپنی زندگی کے تقریباً پچاس سال مختلف اداروں اور متنوع سرگرمیوں میں مشغول رہ کر گزارے۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کی مانیں تو مولانا سید ابوظفر ندوی کے کماحقہ تعارف نہ ہونے کا اصل سبب ان کی شخصیت کا یہی فطری اضطراب تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے ندوہ سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد سب سے پہلے ملتان کے ایک مدرسے میں تدریس کا مشغلہ رکھا۔ ۱۹۱۵ء میں رنگون، برما چلے گئے۔ وہاں کی مصروفیات کی تفصیلات معلوم نہیں ہیں۔ ان کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ رنگون میں رہ کر انھوں نے 'تاریخ برہما' اور برمی زبان کے قواعد پر ایک کتاب لکھی تھی۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ برمی زبان میں بھی ماہر ہوگئے تھے۔ یہ دونوں کتابیں دہلی سے شائع ہوئی تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ برما سے دنیا کی سیاحت کے لیے نکلیں، لیکن وسائل مہیا نہ ہوسکے۔ ۱۹۳۲ء میں وہ بابائے قوم موہن داس کرم چند گاندھی کے قائم کردہ مہاودیالیہ، احمد آباد میں عربی کے استاد کی حیثیت سے پہنچے۔

مولانا سید ابوظفر ندوی کی زندگی کا یہی وہ مرحلہ ہے جس میں انھیں گجرات سے خصوصی مناسبت پیدا ہوئی۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ یہ خصوصی مناسبت علامہ سید عبدالحی حسنی کی صحبت اور اُن کی کتاب 'یادِ ایام' کی وجہ سے پیدا ہوئی ہو۔ گجرات کے اس اولین قیام میں انھوں نے محکمۂ آثارِ قدیمہ گجرات کی درخواست پر 'تاریخ گجرات' تحریر فرمائی۔ یہ کتاب ۱۹۵۸ء میں ندوۃ المصنّفین، دہلی سے پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔ اسی زمانے میں انھوں نے 'مرآۃ احمدی' کا ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ 'تاریخ اولیاء گجرات' کے نام سے ۱۹۳۳ء میں احمد آباد سے شائع ہوا۔ یہیں انھوں نے بوہرہ فرقے کی تاریخ پر بھی ایک کتاب لکھی تھی، جس کی اشاعت نہ ہوسکی۔ احمد آباد سے وہ مدراس تشریف لے گئے اور جمالیہ کالج کے پرنسپل رہے۔ یہ سلسلہ بھی زیادہ دن قائم نہ رہ سکا اور وہ وزارتِ تعلیم ریاست جونا گڑھ کی درخواست پر وہاں تشریف لے گئے۔ یہاں سے ایک علمی رسالہ شہاب بھی جاری کیا۔ ریاست کے لیے اپنی علمی و دینی خدمات انجام دینے کے بعد وہ دارالمصنّفین اعظم گڑھ پہنچے۔ وہاں سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندوی کی سربراہی میں ہندستانی تاریخ کا بڑا منصوبہ شروع کیا جارہا تھا۔ مولانا نے پانچ سال دارالمصنّفین میں قیام فرمایا اور اہم تاریخی خدمت

انجام دی۔ مختصر تاریخ ہند، تاریخ خاندانِ غزنہ اور متعدد قیمتی مقالات شائع ہوئے۔ بعد میں تاریخ سندھ اور گجرات کی تمدنی تاریخ بھی وہیں سے شائع ہوئی۔ آج تقریباً ایک صدی کے بعد مولانا کا مجھ جیسا حقیر عقیدت مند اور خوشہ چیں محسوس کرتا ہے کہ مولانا کی اصل جگہ شبلی اکیڈمی ہی تھی۔ نہ جانے وہ وہاں کیوں قیام نہ فرما سکے؟ اگر وہیں کے ہو رہتے تو شاید بڑا کام ہو جاتا۔ آخر کار ۱۹۳۹ میں وہ عربی فارسی کے پروفیسر کی حیثیت سے وشوا بھارتی یونی ورسٹی، شانتی نکیتن، مغربی بنگال پہنچے۔ رابندر ناتھ ٹیگور کی وجہ سے ملک بھر میں اس ادارے کی بڑی دھوم تھی۔ مولانا وہاں تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے، لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گجرات ان کے ذہن و دماغ پر حاوی ہو چکا تھا۔ اس لیے کچھ عرصے بعد انھیں احمد آباد کے ادارہ گجرات ودھیا سبھا کی طرف سے دعوت ملی تو وہ احمد آباد منتقل ہو گئے۔ یہاں انھوں نے تدریس کے فرائض بھی انجام دیے اور تحقیق کا عمل بھی جاری رکھا۔ اسی دوران قیام میں انھوں نے علامہ محمد بن طاہر پٹنی کے حالات پر مشتمل ایک عربی رسالے کا ترجمہ کیا اور اُس کی ضخامت سے دوگنا مفصل مقدمہ تحریر فرمایا۔ یہ کتاب بھی ندوۃ المصنّفین، دہلی سے ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی۔ اس کا نام 'تذکرہ علامہ شیخ محمد بن طاہر محدث پٹنی' ہے۔ آخر کار یہ آٹھواں ادارہ ہی ان کی آخری علمی منزل ثابت ہوا۔ ۱۹۵۸ء میں اپنے وطن دیسنہ، بہار میں انھوں نے وفات پائی۔

مولانا سید ابوظفر ندوی کو شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی سے شرفِ تلمذ بھی حاصل تھا۔ ان کے اندر علم تاریخ کا اعلیٰ ذوق علامہ شبلی سے تعلق کے نتیجے میں پیدا ہوا یا نہیں؟ اس سلسلے میں کوئی حتمی بات تو نہیں کہی جا سکتی، البتہ اتنا طے ہے کہ اس ذوق کو سنوارنے اور نکھارنے میں علامہ شبلی نعمانی کا ہی کردار تھا۔ مکاتیب شبلی میں مولانا ابوظفر کے نام سے علامہ شبلی کے نو خطوط ہیں۔ ان خطوط سے ان پر علامہ کے اعتماد کا بھی علم ہوتا ہے اور استاد شاگرد کی بے تکلفی کا بھی۔ علامہ شبلی سے مولانا کی عقیدت مندی کا ہی نتیجہ تھا کہ ان کی تحریر میں علامہ کے اسلوب نگارش کی واضح جھلک نظر آتی ہے۔ درس گاہِ شبلی سے تیار ہونے والے اصحاب قلم کی کتنی ہی مختصر فہرست تیار کی جائے، اس میں ایک نام مولانا سید ابوظفر ندوی کا بھی ہوگا۔

مولانا سید ابوظفر ندوی کو روحانیت سے فطری لگاؤ تھا۔ انھیں اپنے والد گرامی حضرت سید ابوحبیب دسنوی کے ساتھ خانقاہِ مجددیہ بھوپال حاضری کی سعادت بھی حاصل ہوئی تھی۔ ان کی زندگی کا آغاز والد محترم کے روحانی سائے میں ہوا تھا اور اُن کے چچا علامہ سید سلیمان ندوی آخر تک اُن کی دست گیری فرماتے رہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ مولانا ابوظفر ندوی اپنی تمام تر علمی و تدریسی مصروفیات کے باوجود ایک سالکِ راہِ طریقت کی طرح زندگی گزارتے تھے۔ سفر و حضر میں بھی نوافل کا اہتمام، ذکر و اذکار کا التزام اور خوش طبعی و جرأت و بے باکی ان کے نمایاں شخصی اوصاف تھے۔ اُن کو دیکھنے والے اکثر مشاہیر نے لکھا ہے کہ اُن کو دیکھ کر اُن کے چچا علامہ سید سلیمان ندوی کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ وہ ظاہری وجاہت میں اپنے عم بزرگوار کے بہت مشابہ تھے۔

مختلف نوعیتوں سے تحریک آزادی ہند کا حصہ بننا بھی، مولانا سید ابوظفر ندوی کی زندگی کا ایک اہم پہلو ہے۔ وہ بھی اپنے بزرگوں کی طرح قومیت کے علَم بردار تھے۔ لیکن اُن کی زندگی کے دوسرے بہت سے گوشوں کی طرح یہ گوشہ بھی پردۂ خفا میں ہے۔ اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ان تمام گوشوں کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی جائے اور ان کی ایک مرتب سوانح ترتیب دی جائے۔ ساتھ ہی مولانا کی غیر مطبوعہ یا قدیم مطبوع چیزوں کو شائع کرنے کا اہتمام کیا جائے اور مطبوعہ کتب سے بھرپور استفادہ کیا جائے۔

☆☆☆

نعت

محمد سمعان خلیفہ ندوی بھٹکلی

تمھاری یاد میں چھلکا ہے میرے دل کا پیمانہ
بیاں کس طرح آنکھیں کر سکیں گی دل کا افسانہ

چراغِ نور کی محفل میں حاضر باش پروانہ
درِ اقدس پہ لایا ہے عقیدت کا یہ نذرانہ

تمھاری دید کی خاطر دلِ بسمل تڑپتا ہے
کبھی پردہ ہٹا کر تو نگاہِ ناز فرمانا

تمھارے تذکرے سے جانِ جاں تسکین ملتی ہے
مریضِ عشق کی خاطر بہت ہے ذکرِ جانانہ

نسیمِ جاں فزائے کوچۂ جاناں سکھاتی ہے
شرابِ عشق چھلکانا، مشامِ جاں کو مہکانا

یہ سب دردِ محبت کے کرشموں کے سوا کیا ہے
سلگنا اور جلنا، جل کے شمعِ طور ہو جانا

چراغِ حسن اے ماہِ شبستانِ منور تم
نگاہوں میں سمانا، دل کے آنگن میں اتر آنا

کرے ہے قلبِ سمعاںؔ پر نسیمِ شوق گل پاشی
شمیمِ عشق چھڑکے ہے چمن پر رنگِ مستانہ

امتِ وسط

ملتِ ابراهیمی

قرآن کریم کی روشنی میں

مولانا عبدالسبحان ناخدا ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

نبی اکرم ﷺ کے فرمان کے مطابق ملت ابراہیمی سب سے بہترین ملت ہے: ”خیر الملل ملة ابراهيم“۔

ملت درحقیقت اس خاص طریقہ کو کہتے ہیں جو اللہ رب العزت اپنے انبیاءؑ کے ذریعہ لوگوں کی رہنمائی کے لیے جاری کرتا ہے، اس لحاظ سے ملت قریب قریب دین وشریعت کا مفہوم رکھتا ہے، اس لفظ کی نسبت حضرات انبیاءؑ کی طرف رکھی گئی ہے، بالخصوص حضرت ابراہیمؑ کی ملت کو اختیار کرنے کا حکم امت محمدیہ کو بہت تاکید کے ساتھ دیا گیا ہے: ﴿مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِن قَبْلُ وَفِي هَٰذَا﴾ (اپنے باپ ابراہیم کی ملت کو اختیار کئے رہو، اللہ نے تمھیں ”مسلمین“ کا لقب عطا کیا ہے، اس کلام میں اور گزری ہوئی کتابوں میں بھی)۔

ایک طرف اللہ رب العزت نے ملت ابراہیمی کو تھامے رہنے کا حکم دیا ہے تو دوسری طرف ان لوگوں کو نادان قرار دیا ہے جو ابراہیمی ملت سے اپنے آپ کو وابستہ نہیں رکھتے: ﴿وَمَن يَرْغَبُ عَن مِّلَّةِ إِبْرَاهِيمَ إِلَّا مَن سَفِهَ نَفْسَهُ﴾ (ملت ابراہیمی سے وہی شخص لاتعلق رہے گا جو خود اپنے آپ کو احمق وجاہل قرار دے)

ہر انسان جو یہ مبارک آیات تلاوت کرتا ہے اس کے ذہن میں یہ سوال ضرور قائم ہوگا کہ آخر ملت ابراہیمی وہ کون سی عظیم نعمت ہے جس کو تھامے رہنے کی قرآن کریم نے اس درجہ تاکید فرمائی ہے اور جس سے دور دور رہنے والوں کو نادان واحمق قرار دیا ہے، قرآن کریم میں غور کرنے سے خود اس کا جواب بھی آسانی سے مل جائے گا اور ملت ابراہیمی کے خدوخال واضح ہوجائیں گے۔

قرآن کریم کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ ملت ابراہیمی نام ہے مکمل خودسپردگی کا، اس حدتک کہ انسان اپنی ذات، اپنے احساسات، اپنی خواہشات اور اپنے عزائم سب ایک اللہ کے لیے نچھاور کردے۔

حضرت ابراہیمؑ کی پوری زندگی خودسپردگی سے عبارت ہے، کعبۃ اللہ کی تعمیر کے دوران حضرت ابراہیم نے اپنے فرزند حضرت اسماعیل کو ساتھ لے کر کچھ دعائیں مانگی تھیں، وہی دعائیں درحقیقت ابراہیمی ملت کا نقشہ سامنے رکھتی ہیں ان میں ایک دعا یہ ہے: ﴿رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِن ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ﴾ (اے ہمارے پروردگار! ہم دونوں (باپ بیٹے) کو ایسا بنادے کہ ہم اپنے آپ کو مکمل تیرے حوالہ کردیں اور ہماری اولاد میں ایک ایسی امت پیدا فرما جو صرف تیری تابع فرمان ہو)۔

بات صرف دعا کی حد تک نہیں رہی بلکہ اللہ تعالی نے حضرت ابراہیمؑ کو عملاً اس کا حکم فرمایا کہ اے ابراہیم! اپنے آپ کو صرف ہمارے حوالہ کردو: ”اذ قال له ربهٗ أسلم“، حضرت ابراہیمؑ ہر طرح کے امتحانات سے گزر چکے تھے، فوراً بول اٹھے: ”أسلمت لرب العالمين“ (میں تو سراپا رب العالمین کے حوالے ہوں)۔

یہی درحقیقت ملت ابراہیمی ہے، کامل سپردگی، مکمل فنائیت، مسلسل قربانی، اپنے خالق ومالک سے والہانہ وابستگی، اللہ کی محبت کے راستہ میں رکاوٹ بننے والی ہر محبت سے دست برداری، اس کے ساتھ کامل اعتدال اور توازن، جسے اختیار کرنے والی امت کو ’امتِ وسط‘ کہتے ہیں، قرآن کریم نے ایک جگہ اس کی تشریح یوں کی ہے: ﴿قُلْ إِنَّنِي هَدَانِي رَبِّي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ دِينًا قِيَمًا مِّلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ، قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ، لَا شَرِيكَ لَهُ ۖ وَبِذَٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ﴾ (اے محمد ﷺ کہیے: میرے رب نے مجھے نہایت صحیح راستے پر چلایا ہے، نہایت درست ترین طریقہ یعنی ابراہیم کی ملت پر مجھے قائم ودائم رکھا ہے، وہی ابراہیم جو سب سے کٹ کر ایک اللہ کے ہورہے تھے، وہ مشرک نہ تھے (بلکہ سچے مؤمن تھے)، آپ کہیے: بے شک میری نماز، میری قربانی، میرا جینا، میرا مرنا، سب ایک اللہ کے لیے وقف ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، مجھے اسی بات کا حکم ہے، اور میں سب سے پہلے اپنے آپ کو اللہ کے حوالہ کرتا ہوں)۔

ہر انسان کی فطرت میں اللہ رب العزت نے اپنے آپ کی تلاش وجستجو رکھی ہے، یہ پیاس دنیا جہاں کی راحت پا کر بھی نہیں بجھتی ہے، ملتِ ابراہیمی درحقیقت انسان کی اپنی یافت ہے، یہ وہ آبِ حیات ہے جو اس کی فطری پیاس کو تسکین بخشتا ہے، پیاسا دل یہاں سیراب ہوتا ہے، تھکا ماندہ دماغ یہاں سے توانائی پاتا ہے، بے مقصد زندگی یہاں پہنچ کر اپنا رخ متعین کرتی ہے۔

(باقی صفحہ ۲۱ر پر)

اصلاح وتزکیہ

بقائے اُمت کا راز

ڈاکٹر محمد وثیق ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

اُمّتِ مسلمہ کو اقوامِ عالم میں جو امتیازی مقام حاصل ہے، اس کی اصل وجہ وہ بلند وعظیم مقصد ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے مقرر کیا ہے؛ یعنی انسانوں کو جہالت وضلالت کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان و ہدایت کے نور کی طرف لانا، بھلائی ونیکی کا حکم دینا، بدی اور برائی سے روکنا اور اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان ویقین رکھنا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ’’كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ‘‘ (تم بہترین اُمّت ہو، جو انسانوں کی بھلائی کے لیے برپا کی گئی؛ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، برائی سے روکتے ہو، اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو)۔ (آل عمران: ۱۱۰)

یہ بلند مقصد اُمّتِ مسلمہ کو اُن قوموں سے ممتاز کرتا ہے جن کی بنیادیں محض مادّی مفادات، شخصی اغراض اور نفسانی خواہشات پر استوار ہیں، ایسی قومیں اپنے ذاتی مفادات اور نفسانی خواہشات و تقاضوں کی اسیر ہوتی ہیں، جبکہ اُمّتِ مسلمہ کو انسانیت کی خیرخواہی، رہنمائی اور نجات کا فریضہ سونپا گیا ہے، جب تک مسلمانوں نے اس بلند مقصد اور خدائی پیغام کو حرزِ جاں بنائے رکھا، دنیا ان کی اطاعت گزار رہی، انہیں عزت، غلبہ اور عالمی قیادت حاصل رہی اور یہ سب اس بنا پر تھا کہ وہ دعوتِ الی اللہ اور انسانی دنیا کی رہبری اور ہدایت کے فریضہ کو ادا کر رہے تھے۔

لیکن جیسا کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ’’إلى الإسلام من جدید‘‘ میں لکھتے ہیں:

’’مسلمان رفتہ رفتہ دنیا کے انہماک میں مبتلا ہو گئے، ان کا علم کسبِ معاش کا ذریعہ بن گیا مگر احتساب سے خالی، محنت باقی رہی مگر اخلاص ناپید، تجارت جاری رہی مگر ذکرِ الٰہی سے غفلت کے ساتھ، پیشہ باقی رہا مگر دینی بصیرت سے محروم، عمل جاری رہا مگر للّٰہیت وتقویٰ سے عاری اور حکومت موجود رہی مگر دین سے متصادم، یوں پوری زندگی غفلت، جہالت اور مادّیت کے سانچہ میں ڈھلتی چلی گئی‘‘۔

اس طرح اُمّت اپنی بنیادی ذمہ داری دعوت، قیادت اور انسانی رہبری سے دور ہٹ گئی، اپنے مقصدِ وجود اور مفوضہ ذمہ داری ومنصب کو بھول گئی اور اسی دوری نے اسے زوال، کمزوری اور پستی سے دوچار کیا۔ لیکن جب بھی وہ اپنے مقصدِ وجود کی طرف لوٹی، اسے علمی، فکری، تہذیبی اور سیاسی میدانوں میں دوبارہ برتری حاصل ہوئی، اس لیے اُمّتِ مسلمہ کی بقا، اس کی سیادت اور اس کے تمدنی غلبے کی بنیاد مفوضہ دعوتی مشن کی ادائیگی پر موقوف ہے۔

معلم انسانیت ہادی عالم رسولِ اکرم ﷺ نے اپنے صحابہ کی ایسی ہمہ جہتی تربیت کی عقائد کی اصلاح، روحانی، فکری اور اخلاقی تربیت کہ وہ انسانیت کے رہبر، اقوامِ عالم کے رہنما اور تہذیبی وتمدنی انقلاب کے محرک بن کر اُبھرے:

’’دنیا میں رہتے ہوئے مردانِ آخرت اور نقد سودے کے بازار میں آخرت کے قرض کو دنیا کے نقد پر ترجیح دینے والے بن گئے، نہ کسی مصیبت سے گھبراتے، نہ کسی نعمت پر اتراتے، فقر ان کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکتا، دولت سرکشی پیدا نہ کر سکتی، تجارت غافل نہ کرتی، کسی طاقت سے نہ دبتے، اللہ کی زمین پر اکڑنے کا خیال بھی نہ آتا، بگاڑ اور تخریب کا وہم بھی نہ ہو سکتا، لوگوں کے لیے وہ میزانِ عدل تھے، وہ انصاف کے علمبردار تھے، اللہ تعالیٰ کے گواہ تھے، خواہ ان کو اپنے نفس کے خلاف گواہی دینی پڑے، خواہ والدین اور اعزہ کے خلاف جانا پڑے تو اللہ تعالیٰ نے اپنی زمین کو ان کے قدموں میں ڈال دیا اور دنیا کو ان کے لیے مسخر کر دیا، وہ اس وقت عالم کے محافظ اور اللہ کے دین کے داعی بن گئے، رسول اللہ ﷺ نے ان کو اپنا جانشین بنایا، اور آپ خود ٹھنڈی آنکھوں کے ساتھ رسالت اور امت کی طرف سے اطمینان لے کر رفیق اعلیٰ کی طرف سفر کر گئے‘‘۔

(انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، از: مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، ص: ۸۶)

اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ صحیح تزکیہ اور صالح اور مضبوط تربیت ہی ایسے افراد کی تیاری کا بنیادی ذریعہ ہے جو دعوت، قیادت اور رہنمائی کا بوجھ اٹھا سکیں، اُمّت کا نظام اسی وقت درست ہو سکتا ہے جب اس کے ہاں عبادت گزار لوگ بھی ہوں، اہلِ کار اور ذمہ دار افراد بھی اور اہلِ فضل و رہنمائی بھی۔ سچا مؤمن ہی انسانیت کا قلعہ، اللہ کا امین اور انبیا کا وارث ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلامی دعوت کے لیے مخلص کارکن تیار کیے جائیں، انہیں سنبھالا جائے اور اس راہ میں قربانی وایثار کا جذبہ رکھنے والے افراد پیدا کیے جائیں اور اسلامی طرزِ زندگی کو ہر دوسرے نظامِ زندگی پر ترجیح دی جائے۔

(باقی صفحہ ۱۹ ر پر)

دعوت و استقامت

اسلاموفوبیا-نفسیاتی دباؤ اور تہذیبی چیلنج

محمد ناصر ندوی پرتاپگڑھی (دبئی)

دنیا کے فکری اور تہذیبی مباحث میں ایک اصطلاح آج سب سے زیادہ زیرِ بحث ہے، جس کا تعلق اسلام اور مسلمانوں سے پیدا کئے گئے خوف اور غلط فہمیوں سے ہے، جسے 'اسلاموفوبیا' کا نام دیا گیا ہے۔

فوبیا (Phobia) ایک انگریزی لفظ ہے جس کے معنی ہیں: ''غیر معمولی، بے جا، شدید اور غیر عقلی خوف''، یعنی ایسا خوف جس کی کوئی حقیقی وجہ نہ ہو، لیکن انسان کے ذہن میں وہ خوف اس قدر بیٹھ جاتا ہے کہ وہ حقیقت سے زیادہ خطرناک محسوس ہونے لگتا ہے۔

یہ ایک غیر منطقی (Irrational) خوف ہوتا ہے، یہ انسان کے رویّے، سوچ اور فیصلوں کو متاثر کرنے لگتا ہے۔ یہی وہ اسلاموفوبیا غیر منطقی، بے بنیاد اور مصنوعی خوف ہے جو اسلام یا مسلمانوں سے جوڑ دیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے وہ مذہب اور اس کے ماننے والوں کو خطرہ، تشدد یا پس ماندگی کی علامت سمجھا جانے لگتا ہے، حالانکہ اس تصور کی نہ حقیقی بنیاد ہوتی ہے اور نہ عقلی دلیل۔

میڈیا، سیاسی پروپیگنڈے اور مفاد پرست گروہ اس خوف کو تیار کرتے ہیں، اور اسلام کے عقائد و اعمال کو غلط انداز میں پیش کر کے خوف پیدا کیا جاتا ہے، یہی مصنوعی خوف آگے چل کر تعصب، امتیاز اور نفرت میں بدل جاتا ہے۔ 'اسلاموفوبیا' اصطلاح کا مطلب یہ ہے کہ دین اسلام، اس کی تعلیمات، اس کے شعائر اور اس کے ماننے والوں کے بارے میں ایک منظم ذہنی نفرت، خوف یا بدگمانی پیدا کی جائے، یہ ایسا ذہنی ڈر ہے جس کی جڑیں حقیقت میں نہیں، بلکہ پروپیگنڈے، غلط تعبیرات اور تہذیبی رقابتوں میں پیوست ہوتی ہیں۔ جس کے نتیجہ میں اسلام کو خطرہ اور مسلمانوں کو مشتبہ بنا کر دنیا کے سامنے ایک ایسا تصور کھڑا کر دیا جاتا ہے جو نہ عقل کی میزان پر درست ہے اور نہ تاریخ میں اس کا کوئی ثبوت ہے۔

عام لوگ اسے محض مذہبی مخالفت سمجھتے ہیں، لیکن حقیقت میں یہ ایک نفسیاتی دباؤ، تہذیبی دشمنی اور سیاسی مقاصد کے تحت تشکیل دیا گیا خطرناک فتنہ ہے۔ اس کا مقصد یہ باور کرانا ہے کہ اسلامی تہذیب دنیا کے لئے خطرہ ہے، اس کے اصول وحشیانہ ہیں، اس کا نظام زمانے سے متصادم ہے اور اس کے ماننے والے جدید دنیا کے لئے قابلِ قبول نہیں۔ اس فتنہ انگیز سوچ کی ابتدا صرف آج کی دنیا سے نہیں بلکہ کئی صدیوں پہلے کے تہذیبی تصادم سے جڑی ہے۔ لیکن عصرِ حاضر میں جدید ٹکنالوجی، سوشل میڈیا، سیاسی قوتوں اور عالمی تحریکوں نے اسے ایک باقاعدہ فکری جنگ کا رنگ دے دیا ہے۔

یہ مخالفانہ رویہ دراصل ایک ایسا فکری ہتھیار ہے جو مسلمانوں کے خلاف نفسیاتی ماحول پیدا کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس کا مقصد دنیا کو یہ باور کرانا ہے کہ اسلامی تعلیمات سے دور رہنا چاہئے، مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد ایک خطرہ ہے، اور اسلامی شعائر شہری آزادیوں کے خلاف ہیں۔ اس منفی پروپیگنڈے کی وجہ سے عام انسانوں کو یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ مسلمان شدت پسند ہیں، شریعت ظلم کا نظام ہے، پردہ عورت کی غلامی ہے، جہاد دہشت گردی ہے اور اسلام کا معاشرتی نظام غیر اخلاقی ہے۔ یہ تاثر محض لاعلمی کی پیداوار نہیں بلکہ ایک منظم منصوبے کا حصہ ہے۔

یہ غلط فہمی دراصل صدیوں پرانی تہذیبی کشمکش کا تسلسل ہے۔ صلیبی جنگوں نے مغربی ذہن میں مسلمانوں کے خلاف ایک مستقل خوف پیدا کیا۔ بعد میں سقوطِ غرناطہ نے اس نفسیاتی فاصلہ کو اور گہرا کیا۔ یورپی تہذیب جب علمی اعتبار سے پست تھی تو اسلام علمی برتری کا مرکز تھا، یہی بات مغرب کے لئے سخت تکلیف دہ تھی۔ پھر نوآبادیاتی دور کا آغاز ہوا اور مسلمانوں کو زیر کرنے کے لئے ان کی تہذیب، عقیدے اور تاریخ کو کمزور یا مسخ کرنا ضروری سمجھا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی ترقی کے ہر امکان کے خلاف نفسیاتی رکاوٹیں قائم کی گئیں۔ یہی وہ بنیاد ہے جس نے بعد کے زمانوں میں مذہبی تعصب کو ایک ''فکری فلسفہ'' کی شکل دے دی۔

جدید دنیا میں اس تعصبی سوچ نے ایک نیا رخ اختیار کیا۔ میڈیا کے شور نے خطرے کے اس تصور کو بڑھا چڑھا کر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ ایک مخصوص منصوبے کے تحت مسلمانوں کو فلموں، اخبارات، انسائیکلوپیڈیا اور رسائل میں شدت پسند دکھایا گیا۔ جدید ذرائع ابلاغ اور سیاسی لابیوں نے اسے ایسا خوفناک رنگ دیا کہ اسلام کا نام آتے ہی ذہن میں دہشت، سختی اور خون ریزی کا تصور ابھرتا ہے۔

یہ سب ایک طویل فکری مہم کا نتیجہ ہے، محض چند واقعات یا غلط فہمیوں کا نہیں۔ یہ منفی ماحول صرف دوسروں کو اسلام سے دور نہیں کرتا بلکہ مسلمانوں کے اندر بھی احساسِ کمتری پیدا کرتا ہے۔ جب

ایک قوم اپنے بارے میں مسلسل منفی باتیں سنتی رہے، اس کی تاریخ کو مسخ کیا جائے، اس کی تہذیب کا مذاق اڑایا جائے، اس کے نبی ﷺ کے مقام کو نشانہ بنایا جائے، اس کی کتاب کو شک و شبہ کا نشانہ بنایا جائے، تو رفتہ رفتہ اس قوم کے اندر بھی ذہنی کمزوری پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی ذہنی غلامی ہے جسے دشمن قوتیں پورے اہتمام سے پیدا کر رہی ہیں۔ ذہنی غلامی جسمانی غلامی سے زیادہ تباہ کن ہوتی ہے، کیونکہ جسمانی غلامی کسی دن ختم ہو سکتی ہے، مگر ذہنی غلامی دل و دماغ کو اس طرح جکڑ لیتی ہے کہ انسان اپنی عظمت، اپنی تاریخ اور اپنی خودی کو بھول بیٹھتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آج کے نوجوان بڑی آسانی سے مغربی اقدار کو "ترقی" سمجھ بیٹھتے ہیں، جبکہ اسلامی اقدار کو پسماندگی، وہ اپنی ظاہری شناخت کو چھپاتے ہیں، دین کے احکام میں جھجک محسوس کرتے ہیں، اسلامی تہذیب پر شرمندہ ہوتے ہیں۔ یہ سب اس فکری دباؤ کا نتیجہ ہے جس نے مسلم ذہن پر قبضہ کر رکھا ہے۔ دشمن کے پروپیگنڈے نے انہیں یہ باور کرایا ہے کہ جدید دنیا میں کامیابی کا راستہ صرف مغربی سوچ، مغربی لباس اور مغربی تہذیب سے ہو کر گزرتا ہے۔ در اصل یہ ذہنی شکست اصل خطرہ ہے۔

یہ فکری حملہ صرف ذہنی غلامی تک محدود نہیں، یہ ایک تہذیبی جنگ بھی ہے۔ جب دو تہذیبیں باہم ٹکراتی ہیں تو دونوں میں سے ایک اپنی شناخت قائم رکھنے کی کوشش کرتی ہے اور دوسری مخالف تہذیب کو کمزور کرنے میں لگی ہوتی ہے۔ مغرب کی جدید تہذیب کے سامنے اسلامی نظام حیات ایک مکمل، منظم، روحانی اور اخلاقی قوت بن کر کھڑا ہے۔ مغربی تہذیب کا خاندانی نظام ٹوٹ چکا ہے، معاشرتی ڈھانچہ بکھر چکا ہے، روحانی خلا بڑھ رہا ہے، اخلاقی اصول منہدم ہو چکے ہیں، جبکہ اسلام کا نظام اپنی مضبوطی اور جامعیت کے ساتھ قائم ہے۔ اس لئے مغربی قوتیں خوفزدہ ہیں کہ اگر اسلام اپنی اصل روح کے ساتھ دنیا کے سامنے آجائے تو ان کی مصنوعی تہذیب کا پردہ چاک ہو جائے گا۔ یہی وہ خوف ہے جس نے معاندانہ روش کو مزید تیز کیا ہے۔

اسلامی معاشرت کے اصول، مثلاً حیا، پردہ، خاندان کا تقدس، بندگی کا تصور، عدل پر مبنی معاشی نظام، سود کی حرمت، حقوقِ انسانیت اور اخلاقی بلندی وغیرہ وہ اصول ہیں جو مغرب کے لبرل فلسفے کے مخالف ہیں۔

مغرب کا انسان خدا سے نہیں بلکہ اپنی خواہشات کا تابع ہے، جبکہ اسلام انسان کو اللہ سے جوڑتا ہے۔ یہ بنیادی فرق دونوں تہذیبوں کے درمیان ایک مسلسل فکری مقابلہ پیدا کرتا ہے۔ یہی وہ تہذیبی میدان ہے جس میں اسلام کو کمزور کرنے کے لئے مختلف ہتھیار استعمال کئے جا رہے ہیں۔

میڈیا اس معرکے کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ ہزاروں فلمیں اور ڈرامے ایسے مناظر پیش کرتے ہیں جن میں مسلمان کو جنگجو، سخت مزاج، خواتین پر ظلم کرنے والا یا انسانی اقدار سے بے خبر فرد کے طور پر دکھایا جاتا ہے۔ اخبارات اور سیاسی مباحث میں اسلامی تعلیمات کے مثبت پہلو غائب ہیں، صرف منفی رخ کو بڑھا کر دکھایا جاتا ہے۔ نوجوانوں کے ذہن انہی تصویروں سے بنتے ہیں۔ پھر نصابِ تعلیم میں اسلامی مجدّ دین، مسلم سائنسدانوں، حکمرانوں اور مصلحین کا ذکر حذف یا مسخ کر دیا گیا ہے، تا کہ نئی نسل کا اپنے ورثے پر اعتماد باقی نہ رہے۔ اس منفی فضا کے اثرات آج پوری دنیا میں واضح طور پر محسوس کئے جا رہے ہیں۔ مسلمانوں کے خلاف تشدد کے واقعات بڑھ رہے ہیں، مسجدوں پر حملے ہو رہے ہیں، قرآن کی بے حرمتی کے واقعات عام ہو چکے ہیں، حجاب کرنے والی خواتین کو نشانہ بنایا جاتا ہے، مسلم نوجوانوں کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ان سب مظاہر کا مقصد صرف ایک ہے: دنیا کو اسلامی تہذیب سے خوفزدہ رکھنا اور مسلمانوں کو دفاعی پوزیشن میں پہونچا دینا۔

یہی وہ مقام ہے جہاں مسلمانوں کو اپنی ذمہ داریاں سمجھنی ہوں گی۔ سب سے پہلی ذمہ داری ہے کہ ہم دنیا کے سامنے اسلام کی اصل تعلیمات کو پیش کریں۔ ہمارا دین شدت پسندی نہیں بلکہ رحمت اور انسانیت کا دین ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے قول و فعل سے دنیا کو امن، عدل، خیر خواہی اور محبت کی راہ دکھائی۔ اسلامی تعلیمات اخلاق کو سنوارتی ہیں، انسانیت کو جوڑتی ہیں، ظلم کو مٹاتی ہیں اور عدل کو قائم کرتی ہیں۔ افسوس کہ دشمن نے ہمارے دین کی تصویر مسخ کر دی ہے اور ہم نے اس تصویر کو درست کرنے کی کوشش نہیں کی۔

دوسری اہم ذمہ داری یہ ہے کہ مسلمان علمی سطح پر اپنی کمزوریوں کو دور کریں، فکری جنگ جذبات سے نہیں جیتی جاتی، اس کے لئے مضبوط دلیل، گہرا مطالعہ، بھرپور تحقیق اور واضح نظریہ درکار ہوتا ہے۔

دنیا کی یونیورسٹیوں میں اسلامیات، جدید علوم اور عالمی سیاست کے ماہرین پیدا کرنا وقت کی ضرورت ہے۔ نوجوان جب علمی بنیادوں پر اسلام کو سمجھیں گے تو دشمن کے ہر اعتراض کا جواب دلیل سے دے سکیں گے۔

تیسری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم اپنے اخلاق کو سنواریں۔ دنیا نظریات سے نہیں بلکہ کردار سے متاثر ہوتی ہے۔

(باقی صفحہ نمبر ۱۹؍ پر)

تذکیر وارشاد

اچھے اخلاق کے فوائد اور اثرات

محمد کلام الدین ندوی (معاون انچارج مجلس تحقیقات ونشریات اسلام-لکھنؤ)

الله تعالیٰ نے انسان کو اپنی بہترین مخلوق بنایا ہے، انسان کی اصل خوبصورتی اس کے چہرہ میں نہیں بلکہ اس کے اخلاق میں ہوتی ہے، اچھے اخلاق رکھنے والا انسان ہر دل عزیز ہوتا ہے، لوگ اس کی باتیں سن کر خوش ہوتے ہیں اور اس کی صحبت میں راحت محسوس کرتے ہیں، اچھے اخلاق انسان کی شخصیت کا سب سے خوبصورت زیور ہیں، اخلاق کا مطلب ہے: اچھے برتاؤ، نرم گفتگو، اور دوسروں کے ساتھ حسنِ سلوک۔

دنیا میں عزت ومقام طاقت یا دولت سے نہیں بلکہ اچھے اخلاق سے ملتا ہے، ایک بااخلاق انسان جہاں کہیں بھی جاتا ہے، محبت اور احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

اچھے اخلاق کی بنیاد سچائی، امانت داری، انصاف اور ہمدردی پر ہوتی ہے، جو شخص جھوٹ سے بچتا ہے، وعدہ پورا کرتا ہے اور دوسروں کے حقوق کا خیال رکھتا ہے، وہ اخلاق کی بلندیوں پر ہوتا ہے۔ نرم لہجہ، مسکرانا، بڑوں کی عزت کرنا، چھوٹوں پر شفقت کرنا، غریب اور مجبور لوگوں کی مدد کرنا، یہ سب اچھے اخلاق کی پہچان ہیں۔

ہمارا دین بھی اخلاق کی تعلیم دیتا ہے، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ”میں حسنِ اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں“ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اخلاق کا مقام بہت بلند ہے، قرآن میں بھی بار بار صبر، برداشت، معافی اور نرمی کی تاکید کی گئی ہے۔

اچھے اخلاق نہ صرف دوسروں کو فائدہ دیتے ہیں بلکہ انسان کی اپنی زندگی کو بھی پر سکون اور خوشگوار بناتے ہیں، جو شخص لوگوں کے ساتھ اچھا رویہ رکھتا ہے، لوگ بھی اس کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ کرتے ہیں، لڑائی جھگڑے، بدگمانی نہیں ہوتی، دلوں میں محبت بڑھتی ہے اور معاشرہ امن کا گہوارہ بنتا ہے۔

ہمیں چاہئے کہ ہم اپنے گھروں، اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور معاشرے میں اچھے اخلاق کی مثال بنیں، سچ بولیں، ایک دوسرے کی غلط شکوہ شکایت سے پرہیز کریں، نرم مزاج رہیں، دوسروں کی غلطیوں کو معاف کرنا سیکھیں، اور ہمیشہ دوسروں کے لیے آسانی پیدا کریں، یہی وہ صفات ہیں جو انسان کو بہترین انسان بناتی ہیں۔

الله تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے: ”وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ“ (اور بے شک آپ ﷺ بلند کردار کے مالک ہیں)۔ (سورہ قلم: ۶۸)

اسلامی تعلیمات میں اخلاق کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اخلاق انسانی زندگی کا روشن کردار اور پاکیزہ سیرت کا آئینہ دار ہوتا ہے، انسان وحیوان کے درمیان جو چیز حد فاصل ہے، جو انسان کو حیوان سے ممتاز بناتی ہے، وہ اخلاق ہی ہے۔

اخلاق ایک ایسی صفت ہے جو انسانی صفات کا احاطہ کرتی ہے، بلکہ انسانی اکتسابات میں رنگ ونکہت اخلاق کے ذریعہ ہی پیدا ہوتا ہے، اخلاق کا مطلب ہے عادات واطوار اور میل جول کے طور طریقے۔ اگر کسی کے عادات و اطوار اور میل جول کے طریقے اچھے ہیں تو وہ اخلاق حسنہ سے متصف ہے اور اگر میل جول کے طریقے غلط ہیں اور اطوار وعادات میں برائی کا عنصر پایا جاتا ہے تو اسے بداخلاقی سے تعبیر کیا جائے گا اور اسے اخلاق سیئہ کہیں گے۔

معاشرہ انسانی میں اگر اچھے اخلاق کے حاملین موجود ہوں تو وہ معاشرہ امن وامان، اخوت ومحبت، چین وسکون، اور جذبہ بہی خواہی، مروت ووفا کشی کا مظہر ہوتا ہے، اور اگر سماج میں بداخلاق و بدکردار لوگ پائے جائیں تو معاشرہ گھناؤنا، گھٹیا اور انتشار واضطراب کا شکار ہوتا ہے۔

حضور اکرم ﷺ کی جس وقت بعثت ہوئی اس وقت معاشرہ میں بداخلاقی، اور بدکرداری کا تسلط تھا، انسانی زندگی کا مزاج بگڑ چکا تھا، اور انسانیت لب دم آخری سانس لے رہی تھی، آپ کی آمد کی برکت سے انسانیت کو زندگی کا سلیقہ ملا، بداخلاقی کی جگہ خوش اخلاقی نے لے لی، لوگ برائی کو برائی باور کرنے لگے، اچھائیوں اور اچھی صفات کو فروغ ملا، آپ ﷺ کی بعثت کا مقصد ہی بداخلاقی کے فساد اور انارکی کو دور کرکے اس کو نیکیوں پر استوار کرنا تھا ’بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ‘ اچھے اخلاق کی تکمیل کرنا میری بعثت کا مقصد ہے۔

رسول کریم ﷺ نے ہمیں اخلاق حسنہ کی تعلیم دی ہے، آپ خود بھی اخلاق حسنہ کا مکمل ترین نمونہ تھے، اور آپ نے لوگوں کو بھی یہی تاکید فرمائی ہے کہ ہر معاملہ میں اخلاق حسنہ کو اپنایا جائے، آپ ﷺ کی صفات عالیہ کا تذکرہ فرماتے ہوئے حضرت حسین ؓ نے فرمایا’ آپ نرم خو اور شفیق تھے، رافت ومہربانی آپ کا امتیازی وصف تھا، سخت مزاجی اور تنگ دلی سے آپ کو نفرت تھی، کوئی بری بات زبان سے نہ نکالتے تھے، کسی معاملہ میں شور وہنگامہ نہیں کرتے تھے، کسی کی عیب جوئی نہیں کرتے تھے، جو بات آپ کو ناپسند

ہوتی اس سے اعراض فرماتے تھے، کوئی شخص کسی چیز کی امید رکھتا اور آپ سے سوال کرتا تو اسے مایوس نہ کرتے، تین چیزوں سے آپ کنارہ کش رہے: (۱) بحث ومباحثے سے (۲) ضرورت سے زیادہ باتیں کرنے سے (۳) جس معاملہ سے کوئی تعلق نہ ہو اس میں دخل انداز ہونے سے۔ دوسرے کی دل جوئی فرماتے اور اس کی بات نہایت غور اور توجہ سے سنتے، جب تک وہ بات ختم نہ کرلیتا خاموشی اختیار فرمائے رکھتے، کسی کو بات بات میں ٹوکنا اور سلسلہ گفتگو آگے نہ بڑھنے دینا آپ کے مزاج کے منافی تھا۔

ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے **’أكمل المؤمنين إيمانا أحسنهم خلقاً‘** کامل ترین ایمان مسلمانوں میں اس کا ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں، **خيار كم احسنكم خلقاتم** میں سب سے اچھا شخص وہ ہے جس کے اخلاق اچھے ہوں، ایک روایت میں آیا ہے **’احب العباد الله الی الله احسنهم اخلاقا‘** بارگاہ الٰہی میں سب سے پیارا شخص وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔

لہٰذا آج ہم اپنی زندگی پر غور کریں کہ ہمارے اخلاق کیسے ہیں؟ کیا ہم کسی معاملے میں اپنے آپ کو ترجیح تو نہیں دے رہے ہیں؟ کمزور اور غریب کو وہی حیثیت دیتے ہیں جو امیر اور طاقتور کو دیتے ہیں، یا ہم ہر معاملے میں اپنی ذات کو مقدم قرار دیتے ہیں، اور اپنے مفاد کے حصول کے لئے دوسروں کو نقصان پہنچانا ہماری فطرت ثانیہ بن چکی ہے، اپنی طرف اچھائی اور دوسروں کی طرف برائی منسوب کرنا ہمارا شیوہ ہوگیا ہے، اس پر ہمیں غور کرنا چاہئے، اور اپنے اخلاق کو سنوارنے کی فکر کرنی چاہئے، اس کے بغیر ہم اتباع نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویدار اور اخلاق نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے علمبردار نہیں ہوسکتے!!

☆☆☆

بقیہ: بقائے امت کا راز

صالح تربیت، قلبی تزکیہ اور ذہنی تشکیلِ جدید اسلامی اصولوں کی بنیاد پر ہی وہ اوّلین ستون ہیں جن پر ایک صالح معاشرہ اور موثّر و رہبر اُمّت کی عمارت کھڑی ہوسکتی ہے اور ایسے افراد کار تیار کیے جاسکتے ہیں جو امت کے مقصدِ وجود اور دعوتی مشن کو پورا کرسکتے ہیں۔

ایک المیہ یہ بھی ہے کہ عصری علوم وفنون کے ماہرین میں بہت سے لوگ اپنے شعبوں میں اعلیٰ مہارت رکھنے کے باوجود اپنی فکری اور عملی زندگی میں انحراف کا شکار ہو جاتے ہیں؛ کیونکہ انہوں نے وہ علم حاصل کیا جو آسمانی ہدایت اور ربانی تربیت سے خالی تھا۔ وہ علم جو ربانی ہدایت اور ایمانی تربیت سے خالی ہو، وہ فکری انحراف، اخلاقی زوال اور تہذیبی گمراہی کی طرف لے جاتا ہے۔ اسی طرح دینی تربیت سے خالی صرف رسمی تعلیم بھی ذہنی انتشار، دینی عقائد اور مسلّماتِ دین میں تشکیک کا سبب بن جاتی ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ جب تک دل کی اصلاح نہ ہو، نفس کی تہذیب وتزکیہ نہ ہو اور ذہن اسلامی سانچے میں نہ ڈھل جائے، معاشرہ فتنوں، ظلمتوں اور گمراہیوں کی لپیٹ میں رہتا ہے۔ اسی حقیقت کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمایا ہے:

”ألا إن في الجسد مضغة، إذا صلحت صلح الجسد كله، وإذا فسدت فسد الجسد كله، ألا وهي القلب۔“ (آگاہ رہو! جسم میں ایک ٹکڑا ہے، جب وہ درست ہوجاتا ہے تو پورا جسم درست ہو جاتا ہے، اور جب وہ خراب ہوجائے تو پورا جسم خراب ہوجاتا ہے اور وہ ہے دل)۔

☆☆☆

بقیہ: اسلاموفوبیا------

اگر مسلمانوں کے اخلاق اتنے روشن ہوجائیں کہ لوگ انہیں دیکھ کر اسلام کو پہچانیں، تو معاندانہ پروپیگنڈے خود بخود ختم ہوجائیں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے بہترین اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہے۔ آج وہی اخلاقی طاقت ہماری سب سے بڑی ضرورت ہے۔

چوتھی ذمہ داری یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنی نئی نسل کی اسلامی تربیت کرنی ہوگی۔ آج کا نوجوان اگر میڈیا کے پروپیگنڈے کے سامنے بغیر تربیت کے چھوڑ دیا جائے تو وہ اپنی شناخت کھو بیٹھے گا۔ اسے بتانا ضروری ہے کہ اسلامی تہذیب نے دنیا کو علم دیا، سائنس دی، حکمت دی، تہذیب دی اور انصاف دیا۔ مسلمان ہزار سال تک دنیا کی قیادت کرتے رہے اور آج بھی اسلام کے پاس انسانیت کی رہنمائی کا مکمل نظام موجود ہے۔

پانچویں ذمہ داری یہ ہے کہ دنیا کے ساتھ مکالمہ کیا جائے۔ غلط فہمیاں علم سے دور ہوتی ہیں اور نفرتیں حکمت سے ختم ہوتی ہیں۔

اسلام کا پیغام دعوت کا ہے، اور دعوت کا راستہ دروازے کھولنے سے کھلتا ہے، دیواریں کھڑی کرنے سے نہیں۔ ہمیں یہ حقیقت سمجھ لینا ضروری ہے کہ یہ سارا فکری دباؤ نہ صرف ذہنی غلامی پیدا کرتا ہے بلکہ مسلمانوں کے خلاف ایک منظم تہذیبی معرکہ بھی ہے۔ اگر مسلمان اپنی شناخت پر ثابت قدم رہیں، اپنے دین پر گہرا یقین رکھیں، اپنی تہذیب پر اعتماد کریں اور اپنی علمی واخلاقی میراث کو زندہ رکھیں تو کوئی طاقت انہیں شکست نہیں دے سکتی ہے، یہ فکری جنگ قلم سے، کردار سے، علم سے، حکمت اور استقامت سے جیتی جاسکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اس تہذیبی چیلنج کو سمجھنے، اس کا صحیح جواب دینے کی توفیق عطا فرمائے۔

☆☆☆

رجوع الی اللہ

اللہ کی مدد کیوں نہیں اترتی؟

محمد سمعان خلیفہ ندوی (استاذ جامعہ اسلامیہ، بھٹکل)

قرآن مجید میں اہل ایمان سے بہت کچھ وعدے کیے گئے ہیں، اور یقینا وہ سب وعدے سچے ہیں، مگر کیا بات ہے کہ جب ہم عالمی اور علاقائی دونوں سطحوں پر امت مسلمہ کی صورت حال کا جائزہ لیتے ہیں تو وہ وعدے امت کے حق میں پورے ہوتے نظر نہیں آتے؟! آیئے اس کے اسباب جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ﴾ (محمد: ۷) (اے ایمان والو! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمھاری مدد کرے گا اور تمھارے قدم جمادے گا)

نیز ارشاد ہے: ﴿وَلَيَنْصُرَنَّ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ﴾ (سورۃ الحج: ۴۰)

(اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا جو اس کے دین کی مدد کرے، بے شک اللہ بڑی قوت والا، زبردست ہے)

اسی طرح فرمایا: ﴿اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا﴾ (البقرۃ: ۲۵۷) (اللہ ایمان والوں کا مددگار ہے)

﴿إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ﴾ (غافر: ۵۱) (ہم ضرور اپنے رسولوں اور ایمان والوں کی دنیا کی زندگی میں بھی مدد کریں گے اور اس دن بھی جب گواہ کھڑے ہوں گے)۔

﴿وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (سورۃ الروم: ۴۷) (اور ہم پر لازم ہے کہ ہم ایمان والوں کی مدد کریں)۔

﴿وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾ (سورۃ آل عمران: ۱۳۹) (اور تم ہی سربلند ہو اگر تم ایمان والے ہو)۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس امت کو بلندی، عزت، نصرت اور زمین میں اقتدار کی خوش خبری دے دو''۔ (مسند احمد)

ان آیات اور احادیث کے باوجود آج مسلمان مجموعی طور پر شکست وریخت سے دوچار اور احساس ہزیمت کا شکار ہیں۔ امت اپنی تاریخ کے ایک نہایت کٹھن مرحلے سے گزر رہی ہے، سرد فکری یلغار کے ساتھ ہی میدان جنگ میں بھی دشمن آمادۂ پیکار ہے، چوطرفہ حملہ، ارتداد کا دور دورہ، آشیاں خزاں کی زد میں اور کارواں احساسِ زیاں سے بھی محروم۔ سفینۂ حیات کا نہ کوئی بادباں، نہ امت کے درد کا کوئی درماں۔ ہر شعبۂ حیات میں اسے کمزوری کا سامنا: دین داری میں کمزوری، ترقی کی دوڑ میں کمزوری، تعلیم وتربیت میں کمزوری، نظمِ معیشت میں کمزوری، عزم و ہمت میں کمزوری، روحانی، فکری اور جسمانی تعمیر میں کمزوری، مادی اور عسکری تیاری میں کمزوری۔

مسلم ممالک ہیں کہ انتشار کا شکار، نظمِ ملت ابتر، صفیں کج، دل پریشاں، سجدے یا تو بے ذوق یا پھر اغیار کی چوکھٹ پر، گھات میں بیٹھ کر دشمن فساد پھیلانے کے لیے کمربستہ: تفرقہ، انتشار، آپسی قتل وقتال، دنیاوی مفادات کی جنگ، دین اور دین کی نسبتوں پر حملے، اخلاق وحیا کے خلاف یلغار، سنت اور عقیدے کے خلاف محاذ آرائی، فحاشی اور بے حیائی عروج پر، نوجوان نسل نشے کی دل دادہ، موبائل اور دیگر فضولیات پر فریفتہ، وقت گزاری اور اس کے نام پر بے مہار آزادی، بے راہ روی اور اس سے آگے بڑھ کر حواس باختگی کی چھوٹ، زندگی میں کوئی مقصدیت نہیں، کوئی اعلی نصب العین نہیں، دنیاوی زندگی کی ایک دوڑ، مادیت کی ایک ہوڑ، حلال وحرام کی کوئی تمیز نہیں، سودی اسکیموں میں بڑھتی دل چسپی، برائیوں کا فروغ اور اشتہار اور بھلائیوں سے ہر کوئی برسرِ پیکار۔

آخر کس سے فریاد کی جائے! بس آہ وفغاں اور دل وجگر دھواں دھواں!!

کیا ہم نے کبھی سنجیدگی سے سوچا بھی ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ اور ہمارا کردار کیا ہونا چاہیے؟ ایمان ہی ہمارا سرمایہ اور یہی ہماری متاعِ گراں مایہ ہے، یہی کامیابی کی شاہ کلید بھی، اور اسی پر دنیا وآخرت کی سعادتوں کا مدار بھی، اسی عقیدے کی بنا پر ہم باوقار بھی، اسی ایمان کی بنیاد پر ہمارا اعتبار بھی، اور یہی اسلامی اخلاق وکردار ہمارا سرمایۂ افتخار بھی!

حضرت عمر نے کیا خوب فرمایا تھا: ''ہمیں اسلام کی بدولت عزت ملی اور جب بھی ہم اسلام کے علاوہ کسی اور چیز میں عزت تلاش کریں گے اللہ ہمیں ذلیل ورسوا کرے گا''۔

لہٰذا دین سے وابستہ رہنے اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کو مضبوطی سے تھامنے میں ہماری عزت ہے۔ اور یہ سب قرآنی وعدے بھی اسی

سے مشروط ہیں۔

دشمنوں کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ امت میں اختلاف، تعصب، نفرت، مایوسی اور احساسِ شکست پیدا کیا جائے، اور مسلمانوں کو یہ باور کرایا جائے کہ وہ کمزور اور مغلوب ہیں۔ تو امت کو اس احساس ہزیمت اور مایوسی سے نکالنا بھی ہماری ذمے داری ہے، اس لیے ہمیں ہر سطح پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

ہر مسلمان اپنی اصلاح سے آغاز کرے، اپنے اخلاق سنوارے، دین، عقیدہ، کتابِ الٰہی اور سنتِ رسول ﷺ سے مضبوط تعلق قائم کرے، شریعت کو اپنے اوپر نافذ کرے، اپنے دین اور عقیدے پر فخر کرے، اور اپنی ذات، اپنے اہل خانہ، نسل نو اور اپنے معاشرے کی اصلاح کے تئیں فکرمند ہو۔

اللہ کی نصرت نہ خوابوں سے ملے گی، نہ محض نعروں اور لچھے دار تقریروں سے، نہ مضمون آفرینیوں سے، نہ فکر وخیال کی بزم آرائیوں سے؛ بلکہ اس کے لیے ہم میں سے ہر شخص کو اپنی ذمے داریوں کو محسوس کرکے عملی اقدامات کرنے ہوں گے۔

سچی توبہ - انفرادی بھی اجتماعی بھی۔ حقیقی رجوع الی اللہ، اور کتاب وسنت کے عملی نفاذ سے اس کی شروعات ہوگی، ظلم سے بچنا ہوگا، حقوق لوٹانے ہوں گے، نمازوں کی فکر، آخرت کا استحضار، اخلاق، حلال رزق، عدل، علم، تربیتِ نسل کے تئیں فکرمندی اور دینی اقدار کو زندگی کے ہر شعبے میں نافذ کرنا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے اور ہمارے جیتے جی امت مسلمہ کی سربلندی کے دن ہمیں دکھائے۔ آمین!

☆☆☆

بقیہ: ملت ابراھیمی

اور کیا خوب متعین کرتی ہے! ﴿فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا﴾ (اپنے رخ کو دین کے لیے یکسو ہو کر سیدھا کرلو) ﴿فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا﴾ (اللہ کی بنائی ہوئی اس فطرت کو دل وجان سے قبول کرلو، اسی پر اللہ نے لوگوں کی فطرتیں بنائی ہیں) ﴿ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ﴾ (یہی درحقیقت درست ترین دین ہے) ﴿وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں)۔

اسی لیے ملتِ ابراہیمی یعنی سراسر خودسپردگی سے بعد رکھنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے احمق وجاہل قرار دیا ہے، جو خود اپنا ہی مقصد پا نہ سکا اس نے آخر کیا پایا؟ سب کچھ پاکر بھی وہ مفلس وقلاش ہی رہا! کیا اس سے بڑھ کر کوئی نادان ہوسکتا ہے جو ہر چیز کا ہدف متعین کرے لیکن اپنا کوئی ہدف متعین نہ کرے؟! یا مصنوعی چند اہداف مقرر کر کے اسی پر خوش ہو! جیسے بچہ شیشہ کے قیمتی گلاس توڑتا چلا جائے، اور اس پر خوش ہوتا رہے کہ گلاس ٹوٹنے کی آواز اسے نہایت بھلی محسوس ہو رہی ہے!!

حضرت ابراہیم نے اپنی کل اولاد کو اسی ملت پر قائم رہنے کی تاکید کی تھی، آنے والی نسلوں میں کچھ کامیاب رہے، کچھ گمراہ ہوئے: ﴿فَمِنْهُم مَّنْ آمَنَ بِهِ وَمِنْهُم مَّن صَدَّ عَنْهُ﴾۔

اخیر میں نبی اکرم ﷺ کو مبعوث فرما کر ملتِ ابراہیمی کا تاج آپ کے سر پر سجا کر اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتیں اس امت پر تمام کردیں، جو شخص اس عظیم نعمت کو پالیتا ہے وہ اس کائنات میں اللہ کا گواہ بن کر زندگی بسر کرتا ہے، اس کی ایک ایک ادا یہ گواہی دیتی ہے کہ اللہ کے لیے جینے مرنے والے کتنے پاکیزہ کیسے مقدس اور انسانیت کے کیسے اعلیٰ معیار پر فائز ہوتے ہیں، خود حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں خداوند قدوس کی یہ گواہی سنیے: ﴿إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّاهٌ مُّنِيبٌ﴾ (ابراہیمؑ سراپا حلم تھے، بڑے آہ وزاری کرنے والے، اللہ کی طرف دل وجان سے متوجہ رہنے والے تھے)۔

اس ملت کے سب سے بڑے علمبردار حضرت محمد مصطفی ﷺ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں گواہی دی: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾ (اے محمد! ہم نے آپ کو سارے جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے)۔

عام اہل ایمان جو ملت ابراہیمیؑ سے وابستگی رکھتے ہیں ان کا منصب یہ ہے: ﴿وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ ۚ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ۚ مِّلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ ۚ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِن قَبْلُ وَفِي هَٰذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ﴾ (اپنے باپ ابراہیمؑ کی ملت سے وابستہ رہو، اللہ نے تمھارا نام ''المسلمین'' رکھا ہے، پہلے بھی اور اس کتاب میں بھی، تاکہ رسول تم پر گواہ بنیں (اس لیے کہ وہ اول المسلمین ہیں) اور تم تمام لوگوں پر گواہ بن سکو)۔

یہ گواہی زبانی ہو کہ بے جھجک اپنے مسلم ہونے کا اعلان کرے اور اس پر فخر محسوس کرے، یہ گواہی قلبی وعملی بھی ہو کہ دل کا سچا اور عمل کا ستھرا ہو، اسی کو ''محسن'' کہتے ہیں، یہ گواہی دعوتی بھی ہو کہ اللہ کا پیغام اس کے بندوں تک بے کم وکاست پہنچا کر حجت تمام کردے۔ کیا ہم اس مطالبہ پر پورے اترتے ہیں؟؟

☆☆☆

ایمان وعلم

اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا

محمد ناظم اشرف ندوی (مفتی دارالافتاء ادارہ شباب اسلامی دہرہ دون)

علم اللہ تعالیٰ کی وہ عظیم نعمت ہے جو انسان کو صرف باخبر ہی نہیں بناتی بلکہ باکردار بھی بناتی ہے، علم محض الفاظ کا انبار نہیں، اور نہ ہی چند اصطلاحات، حوالے اور اقتباسات کا نام ہے، بلکہ علم درحقیقت نورِ ہدایت ہے جو دل کو منور کرتا، فکر کو سنوارتا اور زبان وقلم کو مہذب بناتا ہے۔

جہاں زبان بدکلامی، فحش گوئی اور تلخی کی عادی ہو، وہاں علم کا حقیقی قیام ممکن نہیں، وہاں تو صرف علم کا دھوکا ہوتا ہے، اگر علم انسان کے اخلاق میں نرمی، لہجے میں شائستگی اور گفتگو میں وقار پیدا نہ کرے تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ علم نہیں بلکہ علم کا فریب ہے، جو صورتِ علم میں جلوہ گر ہوکر حقیقت میں جہالت اور فسادِ زبان کو فروغ دیتا ہے، اس لیے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ علم اور بدکلامی ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے، جس طرح نور اور ظلمت ایک جگہ اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ قرآنِ مجید نے اہلِ ایمان کی شناخت ہی ان کی زبان اور گفتگو سے کرائی ہے۔ چنانچہ ارشادِ ربانی ہے:

وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا (البقرۃ: ۸۳)

لوگوں سے اچھی بات کہو۔

یہ حکم کسی خاص طبقے یا مخصوص حالات کے ساتھ مقید نہیں بلکہ ہر حال، ہر موقع اور ہر انسان کے لیے ہے، یہ آیت محض اخلاقی نصیحت نہیں بلکہ مومن کی شناخت کا ایک واضح معیار ہے۔ جو شخص زبان کی شرافت کا پاس نہیں رکھتا، جو اختلاف کے نام پر تضحیک اور تنقیص کا سہارا لیتا ہے، وہ اس قرآنی معیار سے ہٹ جاتا ہے، چاہے وہ اپنے آپ کو کتنا ہی بڑا عالم اور دین کا خادم کیوں نہ سمجھتا ہو۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ بھی سکھایا کہ برائی کا جواب بھی بھلائی سے دیا جائے، لہٰذا ارشاد فرمایا: ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (المؤمنون: ۹۶) برائی کو اس طریقے سے دفع کرو جو سب سے بہتر ہو۔

یہ آیت اس حقیقت کا اعلان ہے کہ مومن کی طاقت اس کی زبان کی سختی اور درشتی میں نہیں بلکہ اس کے لہجے کی نرمی، شفقت اور حسنِ اخلاق میں مضمر ہے، رسولِ اکرم ﷺ کی پاکیزہ ذات اس باب میں ہمارے لیے کامل و مکمل نمونہ ہے۔

اس سلسلے میں ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث شریف نہایت رہنما ہے:

لَمْ يَكُنْ فَاحِشًا، وَلَا مُتَفَحِّشًا، وَلَا صَخَّابًا فِي الْأَسْوَاقِ، وَلَا يَجْزِي بِالسَّيِّئَةِ السَّيِّئَةَ، وَلَكِنْ يَعْفُو وَيَصْفَحُ (الترمذي: ۲۰۱۶)

یعنی آپ ﷺ نہ فحش گو تھے، نہ فحش باتوں کو پسند فرماتے تھے، نہ شور و ہنگامہ کرنے والے تھے، اور نہ برائی کا جواب برائی سے دیتے تھے؛ بلکہ آپ ﷺ معاف فرماتے اور درگزر کرتے تھے۔

اس حدیث کا پیغام یہ ہے کہ نبی ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ حق کو اخلاق کے ساتھ پیش کیا جائے، دعوت کو وقار کے ساتھ پہنچایا جائے، اور اختلاف میں بھی تہذیب کا دامن نہ چھوڑا جائے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں عام انسان پھسل جاتا ہے، مگر نبی ﷺ نے ہمیں یہ سکھایا کہ اخلاق کا اصل امتحان ردِ عمل میں ہوتا ہے، اور دین کی قوت آواز کی بلندی میں نہیں بلکہ کردار کی بلندی میں ہوتی ہے۔

ہمیں سنجیدگی سے اس حقیقت پر غور کرنا چاہیے کہ جس نبی ﷺ کا مشن پوری انسانیت کی اصلاح تھا، آپ ﷺ کے مقابل دشمن صف آرا رہے، آپ ﷺ پر تہمتیں لگیں اور طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں، اس کے باوجود آپ ﷺ کی زبان سے کبھی کوئی فحش لفظ نہ نکلا۔ آپ ﷺ نے بدتمیزی کو دین کا ہتھیار نہیں بنایا بلکہ ہر حال میں وقار، حلم اور اعلیٰ اخلاق کا دامن تھامے رکھا، اور اسی کی اپنی امت کو دعوت دی۔

اس پس منظر میں اگر آج کوئی شخص بدزبانی، طعن و تشنیع، تمسخر اور چیخ و پکار کو دین کی خدمت سمجھتا ہے تو اسے اپنے دل سے یہ سوال کرنا چاہیے کہ کیا وہ واقعی سنتِ نبوی ﷺ کی پیروی کر رہا ہے، یا پھر دین کے نام پر اپنے نفس کی خواہشات کی تسکین کر رہا ہے؟

نبی کریم ﷺ نے ایمان کو بھی زبان کے ضبط اور تحمل کے ساتھ جوڑ کر ارشاد فرمایا: مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْرًا أَوْ لِيَصْمُتْ (البخاری: ۶۰۱۸) جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ یا تو خیر کی بات کہے یا خاموش رہے۔

یعنی ہر کلام علم نہیں، اور ہر لکھنا دعوت نہیں؛ بعض اوقات خاموش رہنا حکمت ہوتا ہے، اور بعض اوقات نرم جملہ سخت تقریر سے زیادہ مؤثر ثابت ہوتا ہے، اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے واضح الفاظ میں فرمایا: إِنَّ اللَّهَ يُبْغِضُ الْفَاحِشَ الْبَذِيءَ (الترمذی: ۱۹۷۲) اللہ تعالیٰ فحش گو اور بدزبان شخص کو ناپسند فرماتا ہے۔

یہ کس قدر خوف کا مقام ہے کہ جس زبان سے اللہ ناراض ہو، وہ زبان کیسے علم اور دین کی نمائندہ بن سکتی ہے؟

ایک جگہ کی بات دوسری جگہ پہنچا کر دلوں میں نفرت اور معاشرے میں فساد پیدا کرے، ایسے اوصاف اخلاقی بلندی نہیں بلکہ اخلاقی انحطاط کی علامت ہیں، کیونکہ اسلام میں زبان کا فساد نہ علم کی پہچان ہے اور نہ دینداری کی، علم تو انسان کو جھکنا سکھاتا ہے، برداشت عطا کرتا ہے، اور اختلاف کے باوجود وقار کے دائرے میں رکھتا ہے۔

افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے زمانے میں بعض لوگ اشتعال، بدکلامی اور ہنگامہ خیزی کو حق گوئی اور غیرتِ دینی کا نام دے کر مطمئن ہو جاتے ہیں، حالانکہ حق کا سب سے بڑا حسن اس کا اخلاق ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے کبھی بدتمیزی کے زور پر حق نہیں منوایا بلکہ اپنے اعلیٰ اخلاق سے دلوں کو مسخر کیا۔ دشمن بھی آپ ﷺ کے کردار کے سامنے جھک گئے، اور مخالف بھی آپ ﷺ کے لہجے کی شرافت کے قائل ہو گئے، لہٰذا جو شخص واقعی عالم بننا چاہتا ہے، دین کا خادم کہلانا چاہتا ہے، اور رسولِ اکرم ﷺ کے طریقے سے نسبت کا دعویٰ رکھتا ہے، اسے سب سے پہلے اپنی زبان اور اپنے قلم کی اصلاح کرنا ہوگی۔ جو زبان فحش بولے وہ علم کی امین نہیں، اور جو قلم نفرت اور درشتی لکھے وہ دین کا ترجمان نہیں۔

ہم سب کو اپنے اخلاق کریمانہ سے اس سنت نبوی کو زندہ و تابندہ کرنا چاہیے کہ ہم حق ضرور کہیں گے مگر حسنِ کلام کے ساتھ۔ ہم اختلاف ضرور کریں گے مگر تہذیب اور وقار کے دائرے میں۔ اور ہم علم حاصل کریں گے تو سب سے پہلے اپنی زبان اور اپنے قلم کو سنواریں گے، یہی قرآن کا پیغام ہے، یہی سنتِ رسول ﷺ کا راستہ ہے، اور یہی علم کی سچی پہچان اور اہلِ ایمان کی حقیقی علامت ہے۔

☆☆☆

زبانی تعلیم کم اور عملی تعلیم زیادہ

مولانا محمد خالد غازیپوری ندوی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اندازِ تعلیم و تربیت کی دوسری خصوصیت جو سب سے زیادہ اہم ہے اور جس کی بساط پر معاشرہ کی اصلاح کا شطرنج کامیاب ہوسکتا ہے، وہ یہ کہ آپؐ نے جس بات کی تعلیم دی، اس کا عملی نمونہ آپؐ نے خود اپنی ذات سے پیش کیا، آپؐ نے نماز کا حکم سنایا، تو آپؐ نے فرمایا کہ: ”صلّوا کما رأیتمونی أصلّی“ (نماز پڑھو جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو)۔

اور نمازیں آپؐ نے اتنی طویل پڑھیں کہ پائے مبارک میں ورم آجاتا تھا، آپؐ نے روزے کا حکم پہنچایا تو اپنی ذات پر اس کا اجراء اس طور پر کیا کہ اس کی تاب کسی دوسرے کے لیے مشکل ہے، صحابہ کرامؓ نے صوم وصال کی اجازت چاہی تو انہیں اس کی اجازت نہیں دی گئی، آپؐ نے نماز باجماعت کی تعلیم دی تو خود عمل کرکے دکھایا کہ ساری زندگی نماز باجماعت کی جو پابندی فرمائی وہ تو اپنی جگہ ہے، عین مرض وفات میں آپؐ نے مسجد کی جماعت نہیں چھوڑی، بلکہ دو آدمی کے کندھوں کا سہارا لے کر مسجد تشریف لائے اور جماعت کے ساتھ نماز ادا فرمائی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ کا حکم دیا تو سب سے پہلے اپنی زندگی میں اس کا بے مثال نمونہ پیش کیا، عام مسلمانوں کو چالیسواں نکالنے کی تلقین فرمائی تو اپنا یہ عمل تھا کہ اپنی ضرورت کو سادہ طریقے سے پورا کرنے کے بعد اپنی ساری آمدنی تقسیم فرمادیتے، ایک دفعہ عصر کی نماز کے بعد خلاف معمول جلدی جلدی گھر تشریف لے گئے اور جلد ہی واپس آئے، صحابہ کرامؓ نے وجہ پوچھی تو فرمایا: ”مجھے نماز میں یاد آیا کہ سونے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا گھر میں پڑا رہ گیا ہے، مجھے خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ رات آجائے اور وہ میرے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) گھر میں پڑا ہو“۔

حضرت ام سلمہؓ بیان فرماتی ہیں کہ ایک دفعہ رنجیدہ گھر میں تشریف لائے، میں نے وجہ دریافت کی تو فرمایا: ”ام سلمہ! کل جو سات دینار آئے تھے، شام ہوگئی اور وہ بستر پر پڑے رہ گئے“، اس عملی تربیت کا نتیجہ یہ تھا کہ جب قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نازل ہوا کہ: ”لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ“ (تم نیکی کا مقام ہرگز اس وقت تک حاصل نہ کرسکو گے جب تک اپنی پسندیدہ چیزوں میں سے اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو)۔

خلاصہ یہ ہے کہ آپؐ کی وہ تعلیم وتربیت جس نے دشمنوں کے دل جیتے اور جس نے وحشی قوم کو تہذیب وشائستگی کے بام عروج تک پہنچا دیا، اس کی سب سے بنیادی خصوصیت یہ تھی کہ وہ تعلیم محض ایک فکر اور فلسفہ نہیں تھی جسے خوبصورت الفاظ کا خول چڑھا کر آپؐ نے اپنے پیروؤں کے سامنے پیش کیا، بلکہ وہ ایک متواتر اور پیہم عمل سے عبارت تھی، آپؐ کی مبارک زندگی کی ہر ہر ادا مجسم تعلیم تھی چنانچہ اگر احادیث نبویؐ کا استقراء کرکے دیکھا جائے تو اس میں قولی احادیث کی تعداد کم ہے اور عملی احادیث کی تعداد بہت زیادہ ہے، جس سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ آپؐ کی تعلیمات نے روئے زمین پر جو حسین و دلکش انقلاب برپا فرمایا، اس میں زبانی تعلیم کا حصہ کم اور عملی تعلیم کا حصہ زیادہ ہے۔

☆☆☆

دستورِ حیات

وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں، وہی طٰہٰ

محمد جاوید اختر ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

نبی کریم حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس تمام نوعِ انسانی کے لیے ایک مکمل لائحۂ عمل اور ضابطۂ حیات ہے، آپؐ ہی وہ فردِ کامل ہیں جن میں اللہ رب العزت نے وہ تمام اوصاف ودیعت کیے ہیں جو انسانی زندگی کے لیے مکمل لائحۂ عمل بن سکتے ہیں، کیونکہ آپؐ اپنی قوم میں اپنے بلند کردار، شیریں اخلاق اور کریمانہ عادات کے سبب سب سے ممتاز تھے۔ نبی کریمؐ سب سے زیادہ بامروت، سب سے زیادہ خوش اخلاق، سب سے زیادہ معزز ہمسایہ، سب سے بڑھ کر دور اندیش، سب سے زیادہ راست گو، سب سے زیادہ نرم پہلو، سب سے زیادہ پاک نفس، سب سے زیادہ خیراندیش، سب سے زیادہ کریم، سب سے زیادہ نیک، سب سے بڑھ کر پابند عہد اور سب سے بڑے امانتدار تھے، حتی کہ آپؐ کی قوم نے آپؐ کا لقب ہی امین رکھ دیا تھا، اور ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپؐ کی صداقت و دیانتداری کو دیکھ کر ہی آپؐ سے شادی کی تھی۔

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ آپؐ نے کبھی بھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا اور اکثر فاقہ پر فاقہ کیے جاتے تھے، ایک اور روایت میں حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریمؐ کے گھر والے ایک ایک مہینہ اس طرح سے گزارتے کہ گھر میں آگ نہ سلگائی جاتی اور ہمارا کھانا یہی ہوتا کھجور اور پانی۔ [سنن ابن ماجہ]

نبی کریمؐ ایک بار نماز پڑھانے کیلئے کھڑے ہوئے، تکبیر ہو چکی تھی، مگر آپؐ صحابۂ کرامؓ کو وہیں کھڑا چھوڑ کر گھر تشریف لے گئے، تھوڑی دیر کے بعد واپس آئے اور نماز پڑھائی، کسی نے اس بے وقت گھر تشریف لے جانے کی وجہ دریافت کی تو آپؐ نے فرمایا کہ گھر میں ایک سونے کا ٹکڑا پڑا رہ گیا تھا، میں نے خیال کیا کہ ایسا نہ ہو کہ وہ گھر میں پڑا رہے اور وقت ایسے ہی گزر جائے۔

اللہ رب العزت نے نبی کریمؐ کو بڑے ہی اعلیٰ اخلاق سے نوازا تھا، یہ آپؐ کے ارفع اخلاق ہی تھے کہ جس نے دشمن کو دوست، بیگانے کو اپنا، سخت دل کو نرم خو بنا دیا تھا، نبی کریمؐ کے اسی بلند اخلاق کی تعریف اللہ رب العزت نے ان الفاظ میں فرمائی ہے کہ: "اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ" (اور بیشک آپ کے اخلاق بہت بلند ہیں)۔ [سورہ قلم]

مؤطا امام مالک میں نبی کریمؐ کا ارشاد ہے کہ: میں بہترین اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں اور حضرت انسؓ نبیؐ کے خادم فرماتے ہیں کہ میں نے دس برس تک نبیؐ کی خدمت کی، اس مدت میں آپؐ نے مجھے اُف تک نہ کہا اور نہ کبھی یہ کہا کہ تو نے یہ کام کیوں کیا یہ کام کیوں نہیں کیا۔ [صحیح مسلم]

یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق ہی تھے کہ جس نے لوگوں کے دلوں سے ظلمت و جہالت کو نکال کر نورِ صداقت اور معرفت الٰہی کو متمکن کر دیا تھا، آپؐ کے اعلیٰ اخلاق اور نرم خو ہونے کی صفت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: "لَوْ کُنْتَ فَظًّا غَلِیْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِکَ" (اگر آپ ترش رو اور سخت دل ہوتے تو لوگ کبھی بھی آپ کے پاس آ کر نہ بیٹھتے)۔ [سورہ آل عمران]

نبی کریمؐ سب سے زیادہ متواضع اور تکبر سے دور تھے، آپؐ اپنے لیے صحابۂ کرامؓ کو کھڑے ہونے سے منع فرماتے تھے، مسکینوں کی عیادت کرتے تھے، فقراء کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے، غلام کی دعوت منظور فرماتے تھے، صحابۂ کرامؓ میں کسی امتیاز کے بغیر ایک عام آدمی کی طرح بیٹھتے تھے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپؐ اپنے جوتے خود ٹانکتے تھے، اپنے کپڑوں میں خود پیوند لگاتے تھے، اور اپنے ہاتھ سے اس طرح کام کرتے تھے جیسے تم میں سے کوئی آدمی اپنے گھر کے کام کاج کرتا ہے، آپؐ بھی انسانوں میں سے ایک انسان تھے، اپنی بکری کا دودھ خود دوہتے تھے اور اپنا کام خود کرتے تھے۔ [مشکوٰۃ المصابیح]

نبی کریمؐ کی حیات مبارکہ انسانیت کے لئے سراپا ہدایت اور کامل نمونہ ہے، آپؐ کی زندگی کا ہر لمحہ اخلاق، رحمت اور حکمت کی ایسی روشنی بکھیرتا ہے جو ہر دور کے انسان کو راستہ دکھاتی ہے، اخلاق حسنہ سیرت نبویؐ کا درخشاں ترین پہلو ہے، صدق، امانت، حلم و عفو آپؐ کی شخصیت میں اس طرح رچے بسے تھے کہ دشمن بھی آپؐ کی سچائی کے معترف تھے، آپؐ نے عمل سے بتا دیا کہ اخلاق ہی دعوتِ دین کا سب سے سب سے مؤثر ذریعہ ہیں۔

الغرض نبی کریمؐ کی زندگی کے یہ درخشاں پہلو ہمیں پیغام دیتے ہیں کہ جو قوم اور فرد اس زندہ ضابطۂ حیات کو اختیار کر لے، اور اس اسوۂ حسنہ کو اپنا لے، اس کی دنیا بھی سنورتی ہے، اور آخرت بھی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

☆☆☆

رسید کتب

تعارف وتبصرہ

محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

عقائد سے متعلق مفتی محمد توصیف قاسمی صاحب کے چند رسائل

عصرِ حاضر میں کفر والحاد جس طرح مسلم سماج کے دروازہ پر دستک دے رہے ہیں، اور ارتداد کے مہیب سائے چاروں طرف پھیلتے نظر آرہے ہیں؛ اس کی بڑی وجہ دینی تعلیمات اور بالخصوص عقائد سے دوری اور ناواقفیت ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دعوت واصلاح کی فکر رکھنے والے بساط بھر کوشش بھی کر رہے ہیں؛ لیکن شاید ان کا سارا زور عام اصلاحِ معاشرہ کے موضوعات جیسے نماز روزہ، سیرت منقبت، حلال حرام، اور عام سماجی خرابیوں پر صرف ہوجاتا ہے۔ عقائد کا ذکر شاذ ونادر ہی ہوتا ہے، جب کہ اس وقت زیادہ زور عقائد پر صرف ہو تو شاید بہتر ہو؛ کیونکہ عقائد میں رسوخ ہی دین پر عمل کے جذبہ کو ابھار سکتا ہے۔

اس ضرورت کو محترم جناب محمد توصیف قاسمی صاحب نے محسوس کیا، جو دینی موضوعات پر تحقیق وتصنیف کا تجربہ بھی رکھتے ہیں۔ اس وقت ان کے چند رسائل تعلیم عقیدہ کے موضوع پر ہمارے سامنے موجود ہیں، جن پر آئندہ سطور میں ایک تعارفی نظر ڈالی جارہی ہے۔

عقیدۂ اطفال

جیبی سائز میں سولہ صفحات پر مشتمل یہ اک مختصر مگر عمدہ رسالہ ہے، جو بچوں کی سطح کے بنیادی عقائد کی تعلیم دیتا ہے۔ اس میں اللہ، رسول، صحابی، اسلام، قبر، قرآن، جنت، جہنم، فرشتے، ختمِ نبوت وغیرہ جیسے اسلام کے بنیادی تصورات کو چھوٹے چھوٹے آسان جملوں میں بیان کیا گیا ہے، سوال جواب کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے، بچوں کی مناسبت سے موٹے موٹے جلی حروف رکھے گئے ہیں اور طباعت کو بھی دلکش بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ آخر میں بچوں کے یاد کرنے کے لیے کلمہ طیبہ، کلمہ تمجید، کلمۂ شہادت اور درود شریف وغیرہ بھی دیے گئے ہیں۔

یہ امت کے نوخیز بچوں کے لیے ایک اچھا تحفہ ہے، جس کو مکاتب اور عصری اداروں کے ابتدائی درجات میں داخلِ نصاب کیا جاسکتا ہے۔

اسلامی عقائد

موصوف مذکور کے قلم سے دوسرا رسالہ ''اسلامی عقائد'' کا عنوان رکھتا ہے۔ یہ دراصل امام اہلِ سنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی رحمۃ اللہ علیہ کی دو اہم تالیفات، ایک 'نفحۂ عنبریہ' اور دوسری 'سیرت خلفائے راشدین' میں بکھری ہوئی ان عبارتوں کا مجموعہ ہے، جو عقیدہ کے باب سے تعلق رکھتی ہیں۔ حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں؛ لیکن ان کے بارہ میں خود مرتب کا نقل کردہ بانیٔ تبلیغ حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کا جملہ بڑی معنویت رکھتا ہے، فرماتے ہیں:

''مغربی یوپی میں جو مقام حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کا ہے، مشرقی یوپی میں وہی مقام امام اہلِ سنت مولانا عبدالشکور فاروقی صاحب کا ہے''۔

مولانا عبد الشکور فاروقی صاحب کی ان عبارتوں یا اقتباسات کو اس سے قبل بھی ''بنیادی اسلامی عقائد'' کے عنوان سے جمع کیا گیا تھا، اور ان کی اشاعت بھی عمل میں آئی تھی؛ لیکن وہاں عبارتیں من وعن نقل کردی گئی تھیں، اور ترتیب بھی ایسی نہیں قائم کی گئی تھی جیسی یہاں فاضل مرتب نے کی ہے، جس کو 'حسنِ ترتیب' کہا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ فاضل مرتب نے ان عبارتوں کی تسہیل وتہذیب کا عمل بھی انجام دیا ہے، اور حسبِ ضرورت وضاحتی عنوان اور حاشیہ بھی لگایا ہے۔ موصوف کے اس کام نے ان اقتباسات سے عصرِ حاضر میں بھی استفادہ آسان تر کر دیا ہے۔

تقریباً پچاس صفحات پر مبنی یہ رسالہ 'توحید'، 'نبوت'، 'قیامت' سے بحث کرتے ہوئے ان دینی مسلمات کو بھی پیش کرتا ہے، جن سے سنیت' شیعیت، قادیانیت، اور دیگر باطل عقائد سے ممتاز ہوجائے۔ اپنے مواد کے اعتبار سے یہ رسالہ 'بقامت کہتر بقیمت بہتر' کا مصداق ہے۔

دینی عقائد

اس سلسلہ کا تیسرا رسالہ ''دینی عقائد'' افادات حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا مجموعہ ہے۔ یہ حضرت تھانویؒ کی طرف منسوب مشہور ومعروف کتاب ''بہشتی زیور'' سے ماخوذ اقتباسات ہیں، جو اسلامی عقائد سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان اقتباسات کو جناب توصیف قاسمی صاحب نے چار ابواب پر ترتیب دیا ہے۔ پھر پہلا باب بھی تین حصوں پر مشتمل ہے، پہلا حصہ 'الٰہیات'

کا عنوان رکھتا ہے، جس میں توحید، ذات وصفاتِ خداوندی، اور کتبِ سماویہ کا ذکر ہے، دوسرا حصہ 'نبوات' کا ہے، جس میں نبوت، انبیاء، ختم نبوت، معجزہ، انبیاء کا مقام اوران کی تعداد کے بارہ میں بتلایا گیا ہے، تیسرا حصہ 'سمعیات' کے عنوان سے معنون ہے۔ اس حصہ میں تقدیر، خلقِ افعال، اسراء و معراج، خیر وشر، ملائکہ، جنات، اولیاء، شعبدہ، کشف و کرامت، علمِ غیب، بدعت، صحابہ ومشاجرات، اہلِ بیت، قبر و برزخ، نفخِ صور اور قیامت، جنت وجہنم وغیرہ سے متعلق عقائدِ دین کو بیان کیا گیا ہے، اوران کے علاوہ ایک مسلمان کو زندگی میں جن نظریات کا حامل ہونا چاہیے، ان میں سے چند اہم اور لازمی امور کی نشاندہی کی گئی ہے، جیسے 'نا امیدی' اور 'لعن وطعن' اور 'رویتِ خداوندی' وغیرہ۔

بابِ دوم میں سیرتِ نبوی کا خلاصہ اور عطر پیش کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں شجرۂ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم، آپ علیہ السلام کی تاریخ ولادت، نشو ونما، ہجرت، صفات و عادات، وفات، ازواج مطہرات، اولاد، اسمائے گرامی، حقوق وغیرہ کو اختصار و جامعیت کے ساتھ خوبصورت وسہل انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

تیسرا باب 'کفریات و بدعات و ذنوب' کے نام سے ہے۔ اس میں کفر وشرک کی باتیں، بدعتیں، برے رسم و رواج، بڑے گناہ، اور گناہوں سے پیش آنے والے دنیوی نقصانات وغیرہ انتہائی مفید باتوں کا ذکر ہے۔

چوتھا باب 'اسماء حسنیٰ' کے عنوان سے ہے۔ اس میں ترجمہ کے ساتھ اسماء حسنیٰ، کلمات اور ایمان مجمل ومفصل بیان کیے گئے ہیں۔

یہ تینوں رسائل ایسے ہیں کہ اگر عوام ان سے استفادہ کرلیں اوران کی باتوں کو ذہن نشین کرلیں تو کافی حد تک ارتداد کے فتنہ کا سد باب ہوسکتا ہے۔ ہمارے عصری تعلیمی ادارے اور دینی مکاتب بھی اپنے اپنے نصاب میں ان کو شامل کرسکتے ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ملک کی مختلف زبانوں میں ان کا ترجمہ بھی کرادیا جائے۔

تینوں رسائل کو 'حکیم الامت فاؤنڈیشن، لکھنؤ' نے عمدہ کاغذ اور رنگین طباعت کے ساتھ شائع کیا ہے، اور ندوہ کے قریبی کتب خانوں سے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

رابطہ کے لیے: ۹۲۳۶۶۵۰۱۳۹

☆☆☆

قومی مسلمان کو مسلمان بنانے کی ضرورت

مولانا شمس الحق ندوی

اس وقت عالمی پیمانے پر مسلمانوں کی تباہی وبربادی کے جو حالات پیش آرہے ہیں، ان کا سبب خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکموں کو توڑنے اور نقد فائدہ کی دُھن میں آخرت سے غفلت کا ہے، جس نے ان کو مغربی قوموں کے در کا بھکاری بنا کر رکھ دیا ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ اس سب کے باوجود حالات کو درست کرنے کی ذرا فکر نہیں، بلکہ ہر دن بجائے دینی صلاح کے فساد فی الدین والے ہی کام کیے جائیں تو پھر دوسرے کا کیا شکوہ اور کیا منہ ہے کسی دوسرے سے صلاح کی امید کا، اللہ تعالیٰ کی رحمت امت کی اصلاح کی طرف صرف اپنے محبوب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل متوجہ ہوجائے تو خیر ہے، ورنہ بربادی وہلاکت تو ہم خود ہی خرید رہے ہیں۔

ہم اعدائے اسلام کی سالہا سال سے چلی آرہی سازشوں کا رونا روتے ہیں لیکن اپنے اندرونی بگاڑ پر نہیں غور کرتے کہ ہمارا کیا حال ہورہا ہے؟ ہماری بڑی تعداد دوسروں کی نقالی میں ان سارے حدود کو پار کرکے قومی مسلمان بن کررہ گئی ہے جن کی وجہ سے وہ اس حد تک گرگئی ہے جس اصلاح کی یہ خود ذمہ دار تھی، اس میں خود گلے گلے ڈوب گئی ہے، محبت سے خالی، انسانیت سے دور، بے حیائی، فحش کاری کی تمام حدود کو پار کرجانے والی قوموں کی ظاہری چمک دمک کے دھوکے میں آکر ان کی نقالی کا ایسا شوق غالب آگیا ہے کہ ہم اپنی ساری قدریں بھول چکے ہیں، یہی نہیں بلکہ بہت سے تعلیم یافتہ اور مغرب زدہ مسلمان دین کو ترقی کی راہ میں رکاوٹ قرار دیتے ہیں۔

اس وقت کا ایک اہم کام یہ ہے کہ قومی مسلمان کو مسلمان بنادیا جائے اور "یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا آمِنُوْا" (اے مسلمانو! مسلمان بنو) کی آواز کو پورے زور وشور سے بلند کیا جائے اور یہ کام انجمن سازیوں، چندہ بازیوں اور کانفرنسوں سے نہیں انجام پائے گا، اس کے لیے ضرورت ہے اخلاص کی، احساس ذمہ داری اور اس تڑپ و بے کلی کی جو محبت الٰہی، خشیت الٰہی، اخلاص للہ، تعلق مع اللہ، رأفت بالمسلمین اور شفقت علی الخلق کی کہ احساس ذمہ داری، ادائیگی فرض، رضائے مولیٰ کے سوا کچھ اور مطلوب ومقصود نہ ہو۔

☆☆☆

علم وفن

کتب خانہ شبلی نعمانی ندوہ سے
شاہی مکتبۂ اسکوریال تک

سید حذیفہ علی ندوی (کیمبرج، برطانیہ)

قرآن کریم کی ایک جامع آیت نے صدیوں سے اہلِ فکر کو ایک ہی نکتے پر جمع رکھا ہے وَتِلْكَ ٱلْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ ٱلنَّاسِ ''یہ دن ہم لوگوں کے درمیان پھیرتے رہتے ہیں'' (آلِ عمران: ۱۴۰) عروج و زوال، غلبہ و کمزوری۔یہ سب تاریخ کے ادوار ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے نظامِ حکمت کے تحت قوموں کے درمیان گردش کرتے رہتے ہیں۔ یہی سنتِ الٰہی ہسپانیہ (اسپین) کی علمی وتہذیبی تاریخ میں پوری آب وتاب سے جلوہ گر ہے۔

ہسپانیہ کی سرزمین صدیوں تک تہذیبی آمد و رفت کی گزرگاہ رہی ہے۔قرطبہ وغرناطہ کے مدارس، محافلِ مترجمین، اطبّا و فلاسفہ کی مجالس، اور کتب خانوں کی وہ درخشاں روایت جس نے یورپ کی فکری بیداری کو عروج تک پہنچایا یہ سب کتبِ تاریخ کی روشن سطریں ہیں۔ پھر زمانہ پلٹا، سقوطِ غرناطہ (۱۴۹۲ء)، تفتیشِ عقائد کی سختیاں، کارڈنیل سیسنروس (Cardinal Cisneros) کے حکم سے عربی کتب کے انبار کا نذرِ آتش کیا جانا، اور مُوریسکوں۔جبراً تبدیلیِ مذہب کے شکار اندلسی مسلمان۔کی جبری جلاوطنی (۱۶۰۹-۱۶۱۴)؛ یہ وہ ظاہری اسباب ہیں جن کی بنا پر ان علمی مراکز کے آثار دھیرے دھیرے مدھم پڑ گئے۔

انہی صدیوں میں بادشاہ فلپ دوم نے پہاڑوں کے دامن میں، میڈرڈ کے شمالِ مغرب کی اس خاموش بستی ۔اسکوریال۔میں محل، عبادت گاہ، اور شاہی کتب خانہ تعمیر کیا۔وہ مسلم دنیا کے اعلیٰ مخطوطات کا تمنائی تھا؛ چنانچہ کچھ نسخے علمی تبادلے سے آئے اور کچھ تلواروں کی چھاؤں میں۔

جنگِ لیپانٹو (۱۵۷۱ء) کے بعد بحری ناکہ بندیوں کا سلسلہ شروع ہوا، اور شمالی افریقہ خصوصاً تونس۔کی سمت سے آنے والی کشتیاں روکی گئیں؛ صندوقچوں میں رکھی ہوئی کتابیں دربار میں پیش ہوئیں، پھر اسکوریال کی الماریوں میں رکھ دی گئیں۔

اسی سلسلے کی ایک کڑی ۱۵۳۵ء میں چارلسِ پنجم کی تونس پر یلغار سے بھی جڑتی دکھائی دیتی ہے، جہاں سے عربی کتب کے انبار یورپ لائے گئے، اور بعد ازاں کچھ اسکوریال تک پہنچے۔ اسی لیے یہاں بہت سے نسخوں میں خطِ مغربی کی جھلک، تونس کی مساجد یا نجی کتب خانوں کی مہریں، اور قدیم تملّک کے آثار ملتے ہیں۔ یوں اسکوریال ایک طرف اشراقِ اندلس کی یادگار ہے، تو دوسری طرف تفتیشِ عقائد کی سرد آہٹ کی گواہ ۔شیشے سلامت، مگر کئی جگہ متن کی آواز مدھم۔

انہی نقل وانتقالِ علم کی روایات میں ایک مستقل باب ''الخزانۃ الزّيدانية'' (Zaydani Library/Collection) کا بھی ہے۔ ۱۶۱۲ء میں سلطان زیدان بن احمد، داخلی خلفشار کے باعث مراکش سے آگادیر کی جانب نکلے تو اُن کی ۔تقریباً چار ہزار مخطوطات پر مشتمل نجی لائبریری۔فرانسیسی قونسل ژاں فیلیپ دے کستلان کے جہاز نوتر دام دے لا گارڈ پر لادی گئی۔کرایہ کی ادائیگی میں تاخیر ہوئی تو جہاز نے امانت اُتارنے کے بجائے مارسے (Marseille) کا رُخ کیا؛ راستے میں ایڈمرل لوئیس فخارڈو (Luis Fajardo) کے زیرِ کمان ہسپانوی بیڑے نے اُسے روک لیا اور یہ علمی خزانہ تحویلِ شاہی میں چلا گیا۔ بعد ازاں یہی مجموعہ اسکوریال کی الماریوں تک پہنچا، جبکہ ۱۶۷۱ء کی آتش زدگی میں اس کا ایک خاصا حصہ جل گیا، تقریباً دو ہزار مخطوطات محفوظ رہے، اور آج 'زیدانیہ' انہی کے باقیاتِ صالحات کا نام ہے۔

اس پس منظر کو ذہن میں رکھے بغیر ہسپانیہ کے اس علمی سفر کی معنویت پوری طرح نمایاں نہیں ہوتی؛ اسکوریال کے عربی ذخیرے کو اسی سیاق میں سمجھنا لازم ٹھہرتا ہے۔روشن ورثے کا تسلسل بھی، زیدانیہ جیسے عبرت خیز ابواب بھی، اور احتسابی ادوار کی سرد آہٹ بھی۔تاکہ واقعات کی محض تفصیل کے بجائے ان کی معنویت، نصیحت، اور عبرت کے پہلو اُبھریں۔

حال ہی میں مجھے اسکوریال کے شاہی کتب خانے میں ایک بین الاقوامی تربیتی پروگرام میں شرکت کا موقع ملا۔ یہ پروگرام پروفیسر نوریہ دی کاستیّا (Nuria de Castilla) اور مسلم مخطوطات کے ماہر پروفیسر فرانسوا دروش (François Déroche) کے زیرِ نگرانی منعقد ہوا۔علم المخطوطات وعلم الخطوط (palaeography) کی لطافتیں۔کاغذ کے ریشے، واٹر مارکس، قطع (quires) کی ساخت، مسطرہ بندی،

قلم کے دباؤ اور خط کی چال۔ اور ساتھ ہی متن کی صحت، اشاریہ سازی، اور فہرستوں کا تنقیدی مطالعہ، یہ سب کچھ نصاب کا حصہ تھا۔ ہر نشست یہ سکھاتی رہی کہ ’حفظِ متن‘ کے ساتھ ’فہمِ متن‘ کا حق بھی ادا ہو؛ محض فنی مہارت کافی نہیں، معنی کی امانت کی حفاظت کے لیے علمی ذوق، دینی دیانت، اور اندرونی کسوٹی ناگزیر ہیں۔ مغربی ادارے رہنمائی اور آئینے کا کردار ضرور رکھتے ہیں، مگر معیارِ آخر نہیں، اسی احساس نے اس تحریر کا زاویہ متعین کیا ہے۔

اسی بنا پر اس تحریر کا مقصد یہ نہیں کہ سفر کے ہر موڑ اور ہر ملاقات کی تفصیل بیان کی جائے؛ بلکہ مدعا یہ ہے کہ اسکوریال کے مشاہدات اور کتب خانہ شبلی نعمانی کی یادوں سے وہ نافع دروس سامنے لائے جائیں جو قاری کے کام آئیں۔ چنانچہ قیام و طعام، نقل و حمل، اور دیگر ذاتی جزئیات کو عمداً مؤخر رکھا گیا ہے؛ جہاں ذکر آیا بھی ہے تو بقدرِ حاجت جو کہ تحریر کے اصل مقصد کی تفہیم میں معاون و مددگار ہو اور جس میں افادۂ عام حاصل ہو۔ اس تحریر کا منہاج ’واقعہ سے سبق‘ ہے: بات معنی کے مخزن کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے، نہ کہ تفصیلِ بے محل کو۔

درحقیقت یہ مرحلہ اسی علمی سفر کی طبعی توسیع ہے۔ فی الحال میں جامعہ لندن میں پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالے کی تیاری کے مراحل سے گزر رہا ہوں؛ جس کا موضوع حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ اور مدرسۂ رحیمیہ، دہلی کا علمی و تفسیری سرمایہ ہے۔ اس قبیل کے مباحث میں بالخصوص محفوظاتِ مخطوطہ کا محض اندراج مطلوب نہیں، بلکہ اصل مأخذ اور سندِ اوّل مقصود ہوتے ہیں؛ جس تک صحیح رسائی دقیق فہم، متواتر مطالعہ، اور اہلِ فن کی رہنمائی سے ممکن ہوتی ہے۔ اسی باب میں جلیل القدر مؤرخ و محقق حضرت مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی صاحب کی علمی صحبت اور مشفقانہ مشوروں نے سمت بھی دکھائی اور معیار بھی سنوارا۔ لہٰذا ظاہری حفاظتی تقاضوں کے ساتھ ’قرأتِ معنویہ‘ یعنی متن کو اس کے تاریخی، لغوی اور فکری سیاق میں رکھ کر پڑھنے کی صلاحیت‘ کو لازمِ تحقیق سمجھا گیا ہے، تاکہ فنی درستگی کے ساتھ فکری امانت بھی سلامت رہے۔

ایک مخطوطہ اور چند ابھرتے ہوئے سوالات

اپنی مطلوبہ فہرست آتے آتے ایک عربی نسخہ پر نظر ٹھہری: ’السِحر والشِعر‘، مصنف: ابو عبداللہ لسان الدین ابن الخطیب کتاب کھولی تو محسوس ہوا متن رواں ہے، تاہم بعض مقامات پر ربط میں خفیف سا انقطاع محسوس ہوتا ہے۔ قرائن بتاتے ہیں کہ کتابت قریب ۹۲۰ھ ہے؛ جسامت ۲۸۰ × ۱۹۰ ملی میٹر، کل ۱۴۵ اوراق، فی ورق ۳۱ سطور؛ مشرقی کاغذ، عمودی chain-lines اور واضح مسطرہ۔ صفحہ ۱۱۵ اور ۱۳۶ تراش دیے گئے ہیں، نتیجتاً اہم حواشی، اشاراتِ معنی، توضیحاتِ شارح، اور کاتب کی یادداشتیں، کٹ گئی ہیں۔ فولیو ۲۶۰v کی عبارت براہِ راست ۲۶۲r سے ملتی ہے؛ درمیانی فولیو (۲۶۱) یا تو ساقط ہے یا غلط جگہ بندھا ہے۔ ۲۶۰v پر متعدد ہاتھوں کی غیر مربوط تعلیقات دکھیں، اور صفحہ ۲۶۰ کے بعد قِطع کا تسلسل بھی منقطع محسوس ہوا۔

اسی نسخہ کا کتابِ دوم الگ مادّی شناخت کے ساتھ سامنے آیا: ۴۵۵ صفحات، مغربی کاغذ، نمایاں واٹر مارکس، قِطع کی نشان دہی کے لئے بالائی کونوں میں سوراخ؛ پہلی علامت صفحہ ۲۸ پر، جبکہ صفحہ ۱۸ پر مرکز کا نشان ہے مگر سلائی نہیں، یہ ایک ساختی تضاد ہے۔ کئی جگہ حواشی تک تراش دیے گئے؛ صفحہ ۶۹ الگ ورق کی صورت میں ملا ہوا؛ صفحہ ۷۹ پر سلائی کے آثار۔ یوں مختلف ادوار کی ’اصلاحات‘ نے معنی کی ڈور میں گرہیں ڈال دیں؛ یہ سب محض مادی پیوند نہ تھے، بلکہ متنی ترتیب پر بھی اثر انداز ہوئے۔

اصل کمی یہ ہے کہ صفحہ نمبر بعد میں ایسے ہاتھ نے ڈالے جنہوں نے متن نہیں پڑھا تھا، نمبر اگرچہ خوش خط تھے، مگر بے سمت رہے، اور عبارت کا تسلسل بگڑ گیا۔ نتیجہ واضح ہے: کتب خانہ صرف عمارت اور عملہ نہیں؛ حقیقی سرمایہ اہلِ علم ہوتے ہیں۔ فہرست کی صحت اور متن کی صحت دو الگ درجے ہیں، ہر ایک کا میدان، جواب دہی جدا ہے۔

مخطوطہ تصویر یا فائل میں دکھائی دے سکتا ہے، تاہم اصل ورق ہاتھ میں ہونے کی کیفیت کچھ اور ہے۔ کاغذ کی سطح، سیاہی کی دھیمی چمک، قلم کے دباؤ کی نزاکت، حاشیے کی نشست جیسی یہ نشانیاں تصویر میں ماند پڑ جاتی ہیں۔ کبھی کاغذ کی رنگت ہی خود زمانہ بتا دیتی ہے، کبھی خط کی روانی خود کاتب کا مزاج اجاگر کر دیتی ہے، کبھی حاشیے کا زاویہ بتا دیتا ہے کہ یہ بات متن سے کس قدر قریب ہے۔ اس لیے فوٹو اور اسکین سہولت تو دیتے ہیں، فہم نہیں؛ فائلیں آسانی پہنچاتی ہیں، فیصلہ نہیں دیتیں۔ جب بصیرتِ علمی، دیانتِ فکری، اور اہلِ فن کی رہنمائی ہمراہ ہو تب ہی درست فیصلہ جنم لیتا ہے۔

کتب خانہ شبلی نعمانی: جہاں کتاب بولنا سکھاتی ہے

ایسے مواقع پر دل خود بخود ندوۃ العلماء کے کتب خانہ شبلی نعمانی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، جہاں کتابیں نہ صرف محفوظ رہتی ہیں بلکہ سمجھاتی بھی ہیں۔ مولانا محمد ہارون اندوری ندویؒ اس کے خاموش معمار تھے۔ ان کے سامنے جلد کی پشت،

غلاف کی تہہ، مسطرہ کی لائن، کاتب کی رفتار سب دلائلِ معنی بن جاتے۔ ہم جیسے طالبِ علم آتے تو شفقت سے وقت دیتے؛ کہتے: "یہ دیکھیے، غلاف کے بیچ جو ورق لگا ہے، اس کا مزاج دیکھیے؛ اور یہ حاشیہ، یہ اصل کی توضیح ہے، بعد کی تحریف نہیں۔"

وہ محض محافظِ مخطوطات نہیں تھے بلکہ تصحیح، تجلید، فولیو بندی، فہرست سازی، ان کے روزمرہ کے کام تھے؛ مگر ہر عمل میں علمی فہم اور دیانت شریک رہتی۔ معروف تھا کہ وہ مظاہر علوم کے فاضل ہیں، مشائخ طریقت سے اجازت رکھتے ہیں؛ سادگی میں وقار اور خدمت میں استقامت، یہی ان کی پہچان تھی۔ ہمارے والد، ماموں، اور نانا تک کا ان سے پرانا تعلق رہا؛ اسی ربط نے ہمیں کتاب سے دوستی کا سلیقہ سکھایا۔ انہی سے جانا کہ کبھی کاتب کے حاشیے میں پورا زمانہ بولتا ہے۔

یہ سلسلہ ایک شخصیت پر رکا نہیں۔ مولانا اویس نمازی ندوی سے بھی ملے، ندوہ سے فراغت کے بعد برطانیہ لوٹ آنے کے باوجود، رہنمائی کا سلسلہ جاری رکھا۔ کتب خانہ شبلی نعمانی کے استعمال کے آداب سکھائے: کون سی فہرست سے آغاز ہو، رجسٹر اور سِلپ کیسے پُر ہوں، نسخہ طلب کرنے کی صحیح صورت کیا ہو، دیکھنے کے اوقات وضوابط کیسے برتے جائیں۔ نادر متون کی نشاندہی، نقل و فوٹو کی ترجیحات، اور مطالعے کے مؤثر زاویوں کی طرف مسلسل متوجہ کرتے رہے۔

ہماری عادت یہ بھی رہی کہ جب بیرونِ ملک سے طلبہ یا محققین آتے، ہم انھیں کتب خانہ شبلی نعمانی تک لے آتے؛ نادر نسخوں کی خرید یا نقل کی سبیل نکالتے؛ بسا اوقات مختصر فہارس خود مرتب کر دیتے تاکہ تلاش کا وقت بچے۔ یوں ندوہ محض درسگاہ نہ رہا؛ بتدریج ایک ایسا مرکز بنتا گیا جہاں سے علم 'باہر' بھی پہنچتا رہا، اور باہر کا طالبِ علم 'اندر' آ کر اپنا حصہ لیتا رہا۔ یہی فضا محض معلومات کی ترسیل نہیں کرتی، بلکہ مزاجِ تحقیق اور سلیقۂ نظر کی تربیت بھی دیتی ہے۔

اسی پس منظر میں یہاں ایک ضروری پیغام ہے: مغرب میں موجود ہر شے معیارِ آخر نہیں بن سکتی۔ یہاں فنّی مہارت بلاشبہ اعلیٰ ہے، نمائشی اہتمام بھی جاذبِ منظر اور مؤثر ہے، مگر متن کی نبض ہر ہاتھ میں نہیں چلتی۔ صفحہ سیدھا لگا دینا کافی نہیں؛ بلکہ اصل یہ ہے کہ معنی صحیح سلامت رہیں۔ جب صفحات کے نمبرات ایسے شخص نے ڈالے ہوں جس نے متن نہ پڑھا ہو، تو صفحے اگرچہ جُڑ جاتے ہیں، مگر عبارت منتشر ہو جاتی ہے۔

فضلائے مدارس کی خدمت میں خیر خواہی پر مبنی ایک گزارش یہ ہے کہ مرعوب نہیں، باریک بیں بنیں؛ بیرونی مراکز سے فائدہ ضرور اُٹھائیں، مگر اپنے علمی ورثے کی کسوٹی ساتھ رکھیں اور اسی پر پرکھیں۔ ہمارا جامع نصابِ تعلیم۔نحو، صرف، ادب، معانی، بلاغت، اصول، فقہ اور تفسیر۔طالبِ علم کے اندر وہ اندرونی پیمانہ قائم کرتا ہے جس سے وہ حاشیے کی آواز اور بعد کی آمیزش میں فرق کر لیتا ہے، کاتب کی لغزش اور ناسخ کی درستی پہچان لیتا ہے، قِطع کی گرہوں میں سے معنی کا سرا ڈھونڈ لیتا ہے۔ اقبال نے کہا تھا ؎

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملّت کے مقدّر کا ستارا

یہی علمی خوداعتمادی وہ سرمایۂ اوّل ہے جس کے بغیر بیرونی چمک دمک نظر آتی ہے، مگر روح میں اُترتی نہیں اور نہ دامنِ دل کو اپنی جانب کھینچ پاتی ہے۔

☆☆☆

خلقِ خدا کی خدمت

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

قرآن مجید میں ایک جگہ نیک بندوں کے ذکر میں آتا ہے کہ یہ لوگ خدا کی محبت میں مسکینوں کو اور یتیموں کو اور قیدیوں کو کھلاتے پلاتے رہتے ہیں اور کہتے رہتے ہیں کہ یہ ہم جو کچھ بھی تمھیں کھلا پلا رہے ہیں اس سے مقصود خدا کی رضا جوئی ہے، نہ کہ تم سے کسی طرح کا معاوضہ قبول کرنا، یا تمھیں احسان مند بنانا..........اور اس مضمون کی یہی آیت نہیں، خدا معلوم کتنی مختلف آیتوں میں، کتنے مختلف طریقوں سے تاکید اسی مضمون کی آئی ہے اور ہمارے رسولؐ کی حدیثیں تو اس سے بھری پڑی ہیں۔ پیروں کا طریقہ ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ عبادت پر عبادت، نیکی پر نیکی کرتے گئے ہیں اور ساتھ ہی ڈرتے لرزتے بھی رہے ہیں کہ دیکھئے یہ نذرانے اخلاص کی بارگاہ میں قبول بھی ہوتے ہیں! اور یہی راہ ہمارے رسولؐ کے رفیقوں اور دنیا جہان کے سارے اہل دل اور روحانیت والوں کی رہی ہے یعنی خلق خدا کی خدمت، بے غرض اور بلا لحاظ معاوضہ۔

☆☆☆

وحدتِ ملت

اتحاد کی مشترک بنیادیں

محمد نفیس خان ندوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء)

اتحاد کا نعرہ کوئی نئی صدائے بازگشت نہیں، بلکہ انسانی تہذیب وتمدن کا ابدی وآفاقی درس ہے۔ تاریخ کے سرد اوراق اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ جب قومیں انتشار کے تھپیڑوں میں بہہ گئیں تو ان کی اجتماعی قوت مٹی میں مل کر رہ گئی؛ اور جب بھی انہوں نے اتحاد کا دامن تھاما تو وہ طاقتیں بھی لرز اٹھیں جن کے رعب کے سامنے سنگلاخ پہاڑوں تک کو ہیبت طاری ہوجایا کرتی تھی۔

انتشار درحقیقت وہ مہلک زہر ہے جو قوموں کی رگوں سے عزم وحوصلہ نچوڑ لیتا ہے اور قافلۂ ملت کو بے وزن، بے سمت اور بے توقیر بنادیتا ہے۔ قرآن مجید نے اسی ابدی قانون کو ایک نہایت جامع اور بلیغ آیت میں یوں بیان فرمایا: ﴿وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ﴾ (اپنے اندر جھگڑے پیدا نہ کرو، ورنہ کمزور ہوجاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی)

لفظ 'ریح' یہاں محض ہوا نہیں بلکہ ایک بلاغی استعارہ بھی ہے؛ وہ قوتِ محرکہ جو جہازوں کے بادبانوں کو بھر دیتی ہے، پرندوں کو آسمان عطا کرتی ہے، اور قوموں کو تاریخ کے افق پر متمکن کردیتی ہے۔ جب یہی ہوا رک جائے تو کارواں بھی ساکن ہوجاتا ہے، اور کشتیٔ ملت بے جان ہوکر رہ جاتی ہے۔

لیکن اتحاد نہ تو محض نعرہ ہے، نہ جلوس وسیمینار، اور نہ ہی چند جذباتی خطابات کا حاصل۔ اتحاد ایک فکری، تہذیبی اور عمرانی فلسفہ ہے؛ یہ یکسانیت (Uniformity) نہیں بلکہ وحدت فی الکثرت کی وہ لطیف حقیقت ہے جس میں تنوع کے رنگ مٹائے نہیں جاتے بلکہ ایک بڑے مقصد کے تحت ہم آہنگ کیے جاتے ہیں۔

اختلافِ رائے انسانی فطرت کا تقاضا ہے، لیکن اختلاف کو ضد میں بدل دینا عقل ودانش کے خلاف ہے۔ مختلف ذہنوں، روایتوں اور مسالک کے درمیان اتحاد اس وقت تک جنم نہیں لے سکتا جب تک یہ اصرار ترک نہ کردیا جائے کہ ہر شخص کو ایک ہی فکری سانچے میں ڈھلنا ہے۔

آج کے دور میں تقریباً ہر ملی اور قومی جماعت اتحاد کا نعرہ بلند کرتی ہے، مگر اس کے ساتھ ہی ایک خفیف مگر مؤثر تاثر بھی دیتی ہے کہ یہ کاروانِ وحدت صرف اسی کے پلیٹ فارم سے ہی ممکن ہے؛ لہٰذا ہر تنظیم اور ہر جماعت کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسی کے ساز سے ہم ساز ہوجائے۔

یہ طرزِ عمل نہ صرف اتحاد کی روح کو مجروح کرتا ہے بلکہ اسے ایک تنگ نظری کی زنجیروں میں جکڑ دیتا ہے، جہاں ہر گروہ اپنے دائرہ کو مرکزِ کائنات سمجھتا ہے اور دوسروں کی شمولیت کو اپنی شرائط پر مشروط کردیتا ہے۔

تجربات شاہد ہیں کہ ایسے خودساختہ انحصار نے کئی عظیم تحریکوں کو ابتدائی مراحل میں ہی ختم کردیا، کیونکہ حقیقی اتحاد تو وسعتِ قلبی اور مشترکہ افق کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے، نہ کہ ذاتی یا جماعتی اجارہ داری پر۔

فکری سطح پر دیکھا جائے تو یہ طرزِ عمل دراصل نفسیاتی برتری (Psychological Superiority) اور خودساختہ مرکزیت کا مظہر ہے، جس میں اتحاد کی دعوت اپنی اصل معنویت کھو کر محض اپنی قیادت و سیادت کے اثبات کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اس نوع کی کوششیں ہمیشہ اختلافات کو کم کرنے کے بجائے انہیں شدید تر کرتی ہیں، اور ملت کی توانائی کو ضائع کرنے کا سبب بنتی ہیں۔

درحقیقت اتحاد کی اصل روح کسی ایک فکر یا جماعت کے گرد گردش کرنے کا نام نہیں، بلکہ وہ مشترک اور آفاقی بنیادیں ہیں جن پر مختلف افکار و آرا کے حامل افراد بھی اپنے فکری امتیازات کے باوجود شانہ بہ شانہ کھڑے ہوسکیں، اور جنھیں باہمی احترام، وسعتِ نظر اور مقصد کی یگانگت ایک مضبوط رشتے میں باندھ دیتی ہے۔

اسی حقیقت کی طرف قرآنِ مجید میں 'حبل اللہ' (اللہ کی رسی) کو مضبوطی سے تھامنے کا حکم دیا گیا ہے، جو دراصل توحید، رسالت اور اعلیٰ اخلاقی اصولوں پر قائم ایک جامع اور مشترکہ بنیاد ہے۔

یہ بنیاد اس قدر مستحکم اور فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ ہے کہ اس پر مختلف مسالک اور متنوع ذہنیتیں بھی اپنی انفرادی شناخت کے ساتھ اکٹھا کھڑی ہوسکتی ہیں۔ اسی اصول کے تحت اقوام عالم کے درمیان بھی ایک وسیع انسانی بنیاد پر اتحاد ممکن ہے: جہاں انسانی وقار، بنیادی حقوق اور اجتماعی ترقی وہ مشترک اقدار بن جائیں جن پر مختلف مذاہب وطبقات کے لوگ متحد ہوسکتے ہیں۔

جہاں تک مسلم امت کا تعلق ہے تو اس کے اندر اتحاد کی ضرورت آج پہلے سے کہیں زیادہ شدید ہے۔ مسالک اور آراء کے اختلافات کے باوجود، ایک وسیع دائرہ میں تمام مسلم جماعتیں

(جن کو 'اہل سنت والجماعت' کا نام دیا گیا ہے)
قرآن کی تعلیمات، سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی بنیادی دعوت و اقدار پر متفق ہیں۔ یہی وہ ضابطۂ مشترک ہے جو ملت کو ایک لڑی میں پرو سکتا ہے۔

اعتقادی یکسانیت نہ مطلوب ہے نہ ممکن، مگر عملی اتحاد- جس میں ملت ایک جسمِ واحد کی طرح حرکت کرے- نہ صرف ممکن ہے بلکہ ناگزیر بھی۔

اتحاد کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ کوئی جماعت اپنے اصول یا اعتقادی بنیادوں سے دستبردار ہو جائے؛ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک کو اپنی حدود میں مکمل آزادی ہو، مگر جب ملت کے وجود یا اس کے اجتماعی مفادات پر کوئی آنچ آئے تو سب ایک ہی صف میں کھڑے ہو جائیں۔ مساجد، مدارس اور دینی ادارے کسی ایک جماعت کی ملکیت نہیں، یہ ملت کی امانتیں ہیں، اور ان کا تحفظ پوری امت کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔

اتحاد کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اکثر ذاتی، مسلکی یا جماعتی مفاد بن جاتا ہے۔ جب تک ملی مفاد کو ذاتی مفادات پر مقدم نہ کیا جائے، حقیقی وحدت کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ نعرے تو بہت لگے، مگر حقیقت یہ ہے کہ سنجیدہ حکمتِ عملی، مضبوط مشترکات اور واضح ایجنڈے کے بغیر کوئی قوم متحد نہیں ہوئی۔

آج وقت کا سب سے اہم تقاضا یہی ہے کہ ہم اپنے مشترکات کو پہچانیں، انہیں مضبوط کریں، اور ایک ایسا پلیٹ فارم تشکیل دیں جس پر پوری امت اعتماد کے ساتھ کھڑی ہو سکے۔ اگر ہم اس قرآنی ہدایت، تاریخی تجربے اور عملی ضرورت کو سمجھ کر آگے بڑھیں تو ملت کی وحدت نہ صرف ممکن ہے بلکہ یقینی ہے، ان شاء اللہ!

☆☆☆

سیرت طیبہ کے سلسلۃ الذہب کا نیا شاہکار

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رحمۃ للعالمین

تالیف: حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مدظلہ العالی

عہد حاضر میں محدثین ہند کی عظیم الشان روایات کے وارث و امین حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی دامت برکاتہم کی تصنیفی و تالیفی زندگی کی حاصل، سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک سے روشنی اور رہنمائی کے لیے موجودہ عہد کے تقاضوں اور جدید انسانی معاشرہ و مزاج کی مناسبت سے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمۃ للعالمینی کی دلنشیں، دلنواز اور دلکش تشریح علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سو سال بعد سیرت نگاری میں مجددانہ کارنامہ تین ضخیم جلدوں میں خیر و برکت کی حامل یہ سیرت مصطفی عرب و عجم کے اہل نظر کی داد و تحسین کے مطابق:

1. حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور سیرت پر لکھنے کا مطلب ہے کہ حرمین شریفین پر بھی قلم اٹھایا جائے، یہ وہ نکتہ ہے جسے ڈاکٹر تقی الدین ندوی نے اس کتاب میں خاص طور پر ملحوظ رکھا۔
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین (ڈاکٹر عبداللہ بن عبدالمحسن الترکی- سابق جنرل سکریٹری رابطہ عالم اسلامی، مکہ مکرمہ)

۲. یہ سیرت پاک کے موضوع پر گراں قدر تصنیف ہے، میں اس کو شیخ ندوی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی خصوصی مہربانی اور فضل ربانی سمجھتا ہوں۔ (ڈاکٹر سعود بن ابراہیم الشریم- امام و خطیب مسجد حرام مکۃ المکرمہ)

۳. یہ جامع انسائیکلوپیڈیا ہے، مشرق و مغرب میں پوری امت اسلامیہ کے لیے گراں قدر تحفہ ہے۔
(ڈاکٹر ابولبابہ طاہر صالح حسین)

۴. یہ عظیم الشان کتاب جامعیت اور دلکشی میں بے مثال اور عظیم شاہکار ہے اور ایسی کتاب ہے جس میں افراط و تفریط دونوں انتہاؤں سے بچ کر اعتدال کا راستہ اختیار کیا گیا ہے، زبان عصر حاضر کے فہم کے مطابق ہے۔
(ڈاکٹر موفق بن عبداللہ- استاذ حدیث جامعہ ام القریٰ)

۵. بنیادی خوبی یہ ہے کہ سیرت نبوی پر لکھنے کے لیے جن باتوں کا علم ضروری ہے اس میں صاحب کتاب کمال مہارت کے حامل ہیں۔ اس کے مطالعہ سے ایمان و عقیدہ کو مضبوطی حاصل ہوتی ہے۔ (مولانا سید محمد رابع ندوی)

دیدہ زیب کتابت، بہتر مجلد خوبصورت سرورق کے ساتھ تین جلدوں کا مکمل سیٹ حاصل کرنے کے لیے جامعہ اسلامیہ مظفر پور اعظم گڑھ یوپی اور دیوبند اور ندوہ کے مشہور مکتبوں سے رابطہ کیا جا سکتا ہے۔

پتہ **جامعہ بُکڈپو** جامعہ اسلامیہ مظفر پور اعظم گڑھ یوپی
موبائل نمبر: 9450876465 9532829745
قیمت: 2000 خصوصی رعایت کے ساتھ قیمت: 750

وفیات

پیر ذوالفقار نقشبندی، نہیں رہے

ادارہ

گذشتہ دنوں ۱۴/دسمبر ۲۵ء کو اک ایسی شخصیت نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا جن کی شہرت اور دائرہ کار کی بنا پر اگر ان کو عالمی شخصیت کہا جائے تو شاید مبالغہ نہ ہو۔ یہ راہِ سلوک وطریقت اور میدانِ احسان وتزکیہ سے وابستہ شخصیت تھی جن کو پیر ذوالفقار کے نام سے جانا جاتا تھا۔

پیر صاحبؒ کچھ عرصہ سے گردہ کے مرض میں مبتلا تھے؛ لیکن اس حال میں بھی تعلیم وتربیت اور دعوت وعمل میں مصروف تھے۔ ان کے انتقال کی خبر نے اک عالم کو متاثر کیا، اور ہر طرف اس سانحہ کے غم کو محسوس کیا گیا۔

پیر صاحبؒ نے یکم اپریل ۱۹۵۳ء میں جھنگ صوبہ پنجاب، پاکستان میں ایک دیندار اور تقوی شعار ماحول میں آنکھیں کھولیں، اور خانگی ماحول کا اثر اپنے اندر جذب کیا۔ ان کے والد اور دیگر اقارب تصوف سے وابستہ تھے، اور اصلاحِ باطن کا اہتمام ان کے یہاں پایا جاتا تھا۔ یہی چیز ان میں بھی منتقل ہوئی، اور یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران ہی آپ بھی اس راہ کے مسافر بن گئے، اور ترقی کرتے گئے۔ گرچہ آپ تعلیم اور پیشہ سے انجینیر تھے، اور ہمارے علم کے مطابق آپ نے باقاعدہ 'عالمیت' کی تعلیم مکمل طور پر کسی دینی تعلیمی ادارہ سے حاصل نہیں کی؛ تاہم آپ نے ابتدائی دینیات اور عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی، بعد ازاں اہلِ علم کی صحبت اور ذاتی مطالعہ سے علمِ دین میں اچھا رسوخ پیدا کیا، جس کی قدر اہلِ علم نے بھی کی اور جامعہ رحمانیہ، جہانیاں منڈی اور جامعہ قاسم العلوم ملتان نے آپ کو دورۂ حدیث کی اعزازی سند سے نوازا۔ اس طرح آپ عامۃ الناس میں بھی بحیثیت عالم یا اسلامی اسکالر کی حیثیت سے جانے گئے، جو یقیناً عصری طبقہ کے لیے ایک مثال ہے۔

اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات کے ساتھ اور اس کے بعد آپ نے عمرِ عزیز کا ایک طویل عرصہ اصلاحِ باطن اور تزکیۂ نفس کے عمل میں گذارا، سنت وشریعت پر عمل کا اہتمام آپ کی زندگی میں دیکھا گیا، اور عشقِ حقیقی کے اثرات وثمرات آپ کی سیرت وکردار میں نظر آئے۔

دینی معلومات کے ساتھ عصری علوم کی آمیزش نے آپ کے اندر وہ جوہر پیدا کیا جس سے آپ سماج کے ہر طبقہ کو مخاطب کرنے کے اہل ہوسکے، اس پر مستزاد اللہ تعالی نے آپ کے بیان واسلوب میں ایسی تاثیر رکھی کہ آپ کے بیانات سے ہزاروں دل متاثر ہوئے، بہت سے گنہ گار تائب ہوئے، اور بے شمار لوگوں نے فسق وفجور کی زندگی چھوڑ کر سنت وشریعت کی زندگی اختیار کر لی:

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

آپ سے اصلاحی تعلق قائم کرنے والوں میں نہ صرف یہ کہ عوام الناس؛ بلکہ خواص اور علماء کے طبقہ سے بھی متعدد شخصیات شامل تھیں۔ آپ نے دعوتی و اصلاحی مقصد کے لیے صرف اپنے ملک ہی میں کام نہیں کیا؛ بلکہ دنیا کے مختلف ممالک کے سفر کیے، اور بعض ملکوں میں متعدد بار جانا ہوا۔ اس کے علاوہ حرمین شریفین کی حاضری کا بھی معمول رہا۔ تقریر و بیان کے علاوہ آپ نے تحریر وقلم کو بھی اصلاح وتبلیغ کا ذریعہ بنایا، اور آپ کی کئی کتابیں منظرِ عام پر آئیں اور مفید ثابت ہوئیں، ان میں سے چند کتابیں یہ ہیں: زادِ حرم، اہلِ دل کے تڑپا دینے والے واقعات، عمل سے زندگی بنتی ہے، عشقِ رسول، دوائے دل، اسیر برما، علمِ نافع، عشقِ الٰہی، خواتینِ اسلام کے کارنامے، اولاد کی تربیت کے سنہرے اصول، فقہ کے بنیادی اصول۔

آپ کے بہت سے خطبات کو بھی جمع وترتیب کے بعد ''خطباتِ فقیر'' اور ''خطباتِ ذوالفقار'' کے عنوان کے ساتھ شائع کیا گیا۔ علاوہ ازیں آپ کا درسِ قرآن بھی، جو بڑا موثر ہوتا تھا، کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔

آپ کے اخلاف میں جناب سیف اللہ احمد اور جناب حبیب اللہ احمد صاحبان ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالی آپ کی دینی خدمات کو شرفِ قبولیت سے نوازے، سیئات سے درگذر فرمائے، درجات بلند فرمائے، اور اخلاف واقارب اور متعلقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ ☆☆☆

فقہی مسائل

سوال وجواب

مفتی محمد ظفر عالم ندوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء)

سوال: اسلامی شریعت میں خلع کسے کہتے ہیں؟ آج کل اس کا رواج بڑھتا جا رہا ہے، اس بارے میں شرعی رہنمائی کریں؟

جواب: ملکیت نکاح کو مال کے عوض لفظ خلع کے ساتھ زائل کرنا اسلامی شریعت میں خلع کہلاتا ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ مزاجی ہم آہنگی نہ ہونے یا کسی اور وجہ سے میاں بیوی میں کسی طرح نباہ نہ ہو سکے اور شوہر طلاق بھی نہ دیتا ہو تو عورت کے لیے جائز ہے کہ مہر معاف کر کے یا کچھ مال وغیرہ دے کر اس سے نجات حاصل کرے، جب شوہر کہے کہ میں نے خلع دے دیا تو اس سے خلع ہو جائے گا اور عورت پر ایک طلاق بائن پڑ جائے گی اور دونوں میں جدائی ہو جائے گی۔

الخلع إزالة ملك النكاح ببدل لفظ الخلع كذا في فتح القدير وحكمه وقوع الطلاق البائن كذافي التبين.

[الفتاوى الهنديه:۱/۵۱۹]

یاد رہے کہ بلا وجہ شرعی خلع لینا گناہ بھی ہے اور ناپسندیدہ بھی۔

سوال: اگر عورت کو ناپاکی کی مخصوص حالت میں خلع دیا جائے تو کیا خلع ہو جائے گا؟

جواب: عورت کو اگر ناپاکی کے دنوں میں بھی خلع دیا جائے تو خلع ہو جاتا ہے۔

ولا بأس بالخلع في الحيض والطهر الذي أصابها فيه۔ [المغني:۱۰/۲۶۹]

سوال: شوہر کا خلع قبول کرنے سے پہلے کیا عورت دوسرا نکاح کر سکتی ہے؟

جواب: خلع دراصل بیوی کی طرف سے طلاق کا مطالبہ ہے، جب تک شوہر اس کو قولاً یا تحریراً قبول نہ کر لے، اس وقت تک خلع نہیں ہوگا، جب خلع ہو جائے تو عدت گزارنے کے بعد عورت کسی دوسرے مسلم مرد سے نکاح کر سکتی ہے، اگر شوہر کی طرف سے خلع نہ ہوا اور اس سے قبل عورت دوسرے مرد سے نکاح کر لے تو یہ نکاح از روئے شریعت اسلامی درست نہیں ہوگا۔

أما الحنفية فقد ذكروا له ركنين ،إن كان بعوض وهما الإيجاب والقبول فلا تقع الفرقة ولا يستحق العوض بدون القبول.

[الموسوعة الفقهية]

سوال: شوہر مال کے بدلہ بیوی کو خلع نہ دے کر طلاق دے تو یہ خلع ہوگا یا طلاق کہلائے گی؟

جواب: مال کے بدلہ جو بھی طلاق ہوگی وہ خلع کہلائے گا اور اس کا حکم ایک طلاق بائن کا ہوگا، اس صورت میں شوہر کو عدت میں رجعت کا حق نہیں ہوگا، اگر طرفین ایک ساتھ زندگی گزارنے پر راضی ہوں تو دوبارہ نکاح کرنا ہوگا۔

[الدر المختار مع الرد:۳/۴۴۴]

سوال: اگر رخصتی سے پہلے خلع ہو جائے تو کیا عورت پر عدت گزارنا لازم ہے؟

جواب: اگر بیوی نے نکاح کے بعد رخصتی سے قبل شوہر سے خلع کا مطالبہ کیا اور اب تک خلوت صحیحہ نہیں ہوئی ہے، اور شوہر نے خلع دے دیا تو لڑکی کے لیے شرعاً عدت کا حکم نہیں ہے، وہ خلع کے بعد فوراً کسی دوسرے مسلم مرد سے نکاح کر سکتی ہے۔

قال الله تعالى : يا ايها الذين آمنوا اذا نكحتم المؤمنات ثم طلّقتموهن من قبل أن تمسوهن فما لكم عليهن من عدة تعتدونها.

[سورة الأحزاب:۴۹]

سوال: کیا والدین کے کہنے پر عورت کے لیے خلع لینا جائز ہے؟

جواب: محض والدین کے کہنے سے خلع لینا جائز نہیں، بلکہ اس وقت جائز ہے جب عورت یہ جان لے کہ میرا اس مرد کے ساتھ نہ موافقت ہو سکتی ہے اور نہ نباہ۔

سوال: کیا خلع سے طلاق ہو جاتی ہے؟ اگر ہوتی ہے تو کون سی طلاق ہوگی؟

جواب: خلع سے ایک طلاق بائن ہوتی ہے، لیکن اگر خلع دینے میں تین صریح طلاقیں بولی یا لکھی جائیں تو پھر تین ہی واقع ہوں گی:

الخلع تطليقة بائنة إلا أن يكون سمى ثلاثاً أو نواها فيكون ثلاثاً.

[مؤطا امام محمد:۵۶۳]

سوال: کیا خلع کے بعد عورت پہلے شوہر سے نکاح کر سکتی ہے؟

جواب: خلع ہونے کے بعد میاں بیوی جب چاہیں باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں، عدت کے اندر بھی اور عدت کے بعد بھی، البتہ یہ ضروری ہے کہ خلع ہونے سے پہلے شوہر نے دو طلاقیں نہ دی ہوں، اگر شوہر پہلے دو طلاقیں دے چکا ہے، تو یہ خلع کے ساتھ مل کر تین طلاقیں ہو گئیں، اس کے بعد زوجین ایک دوسرے پر حرام ہو جاتے ہیں۔

واذا خالع إمراته تزوجها اليه بطلاقين عندنا ، حتى لو طلقها بعد تطليقتين حرمت عليه حرمة غليظة عندنا.

[بدائع الصنائع:۳/۱۸۰]

☆☆☆

ندوۃ العلماء
پوسٹ باکس ۹۳، ٹیگور مارگ، لکھنؤ
۲۲۶۰۰۷ یوپی (ہند)

NADWATUL-ULAMA
PO. BOX 93, TAGORE MARG, LUCKNOW
226007 U. P. (INDIA)

باسمہ تعالیٰ

تاریخ ۲۵/دسمبر ۲۰۲۵ء

Date 25th December 2025

اہلِ خیر حضرات سے

اللہ تعالیٰ کا شکر واحسان ہے کہ حضرت ناظم صاحب ندوۃ العلماء مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی دامت برکاتہم کی سرپرستی میں ندوۃ العلماء اپنی علمی، دینی، تعلیمی وتربیتی خدمات انجام دے رہا ہے، اور ان بیش قیمت اصولوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہے جن کے لیے ندوۃ العلماء کو قائم کیا گیا تھا، یعنی جدید زمانہ میں اسلام کی مؤثر اور صحیح ترجمانی، دین و دنیا کی جامعیت اور علم وروحانیت کے اجتماع کی کوشش، فتنۂ لادینیت اور ذہنی ارتداد کا مقابلہ، اسلام پر اعتماد اور اسلامی علوم کی برتری وامتیاز کا اعلان واظہار، دینِ حق سے وفاداری اور شریعت پر استقامت۔

آپ سے ہماری درخواست ہے کہ وقت کی اس ضرورت اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کی افادیت کو سمجھتے ہوئے پوری فراخدلی، فیاضی اور ہمت سے کام لے کر ان تمام کاموں میں بھرپور تعاون واعانت فرمائیں کہ ہندوستان میں دین کے قلعوں کی حفاظت کی اس سے بہتر کوئی سبیل اور اس سے زیادہ پائدار کوئی صدقہ جاریہ نہیں۔

لہٰذا آپ حضرات سے گزارش ہے کہ اپنے صدقات وعطیات چیک یا ڈرافٹ کے ذریعہ اور آن لائن ندوۃ العلماء کے مندرجہ ذیل اکاؤنٹ میں منتقل فرمائیں، ایسے نازک اور مشکل حالات میں ندوۃ العلماء کے ساتھ آپ کا تعاون نہایت اہمیت رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی کاوشوں کو قبول فرمائے اور ان کو ہمارے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے، آمین۔

(مولانا ڈاکٹر) تقی الدین ندوی	(ڈاکٹر) محمد اسلم صدیقی	(مولانا ڈاکٹر) سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	(مولانا) محمد عمار حسنی ندوی
معتمد تعلیم ندوۃ العلماء	معتمد مال ندوۃ العلماء	مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء	ناظر عام ندوۃ العلماء

NADWATUL ULAMA

عطیات	A/c No. 1086 3759 711
تعمیرات	A/c No. 1086 3759 733
زکوٰۃ	A/c No. 1086 3759 766

IFSC CODE : SBIN0000125 - STATE BANK OF INDIA, MAIN BRANCH, LUCKNOW

ONLINE DONATION LINK

https://www.nadwa.in/donation/

نوٹ: چیک/ڈرافٹ پر صرف یہ لکھیں:

NADWATUL ULAMA

اور اس پتہ پر ارسال کریں:

Nizamat office, Nadwatul Ulama,
Tagore Marge, Lucknow - 226007 (U.P.)

معطیان کرام! براہ کرم اپنے عطیات ارسال کرنے کے بعد مندرجہ ذیل نمبر

+91-8736833376

پر مطلع فرمانے کی زحمت کریں، اس سے دفتری کارروائی میں سہولت ہوگی۔

فجزاکم اللہ خیر الجزاء

website : www.nadwa.in
Email : nizamat@nadwa.in

نوٹ: ندوۃ العلماء لکھنؤ کو دیا گیا تعاون سیکشن 80G انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوگا